فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	5
انوارِ ربانی	قرآن کا معجزہ	ڈاکٹر مقبول احمد شاہد	7
قولِ نبیؐ	وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا	محمود غزنوی	12
خاص مضمون	غصہ پر قابو پائیے	فریدہ خالد	15
نوائے شوق	نعت شریف	اظہر محمد اظہر	21
	میری ماں	صائمہ اسما	22
	غزل	سید انور جاوید ہاشمی	22
	غزل	مشہود ہاشمی	23
	نوید صبح	ذکیہ فرحت	23
	آج کا پاکستان	پروین سیف	24
حقیقت وافسانہ	مصلوبِ وفا	شاہدہ ناز قاضی	26
سلسلہ وار کہانی	وہ اک انداز تیرا	نصرت یوسف	44
انشائیہ	ریڈ اینڈ رائٹ اردو	افشاں نوید	52
گزرا ہوا زمانہ	چند نا قابلِ فراموش مجالس	حکیم سید صابر علی	56
نمایاں خواتین کا تذکرہ	ملکہ رضیہ سلطانہ	آسیہ راشد	60
خفتگانِ خاک	تجھ سا لاؤں کہاں سے!	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	63
سیر و سیاحت	کچھ بوسنیا کے بارے میں	صبیحہ	68
نہاں خانۂ دل	احساس کے رنگ	حفصہ اکرام	72
منتخب کالم	محکمہ تعلیم کا ایک اشتہار	اعجاز احمد	74
	فرعون کا تخت اور سیکولر آمریت	اوریا مقبول جان	76
گوشۂ تسنیم	ہسپتال اور جیل	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	78
محشرِ خیال	حفصہ افضال، فہمیدہ اجمل		80

ابتدا تیرے نام سے

کنارِ نیل چھا گئی پھر ایک بار شامِ غم!

قارئین کرام! عیدالفطر کے فوراً بعد مسلم امہ ایسے خوں آشام حالات میں گھر گئی کہ تذکرہ کرتے ہوئے قلم رُکتا ہے۔ ایسے ناقابلِ یقین، ناقابلِ دید مناظر اور دلدوز واقعات دیکھنا کس کے وہم وگمان میں تھا! فراعنہِ مصر کے جانشین مصر کے فوجی درندے اپنے ہی نہتے شہریوں پر مشین گنیں اور ٹینک لے کر چڑھ دوڑے۔ نوجوانوں، ضعیفوں، عورتوں اور بچوں کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ عالم اسلام نے ایک اور لال مسجد کا سانحہ دیکھا۔ مصر کے باہمت باشندے زخمیوں اور لاشوں کو بھی اٹھاتے رہے، گرفتاریاں بھی دیتے رہے اور میدانِ احتجاج کو بھی آباد رکھا۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے!

اخوان المسلمون کی انتخابی کامیابی کو ہضم نہ کرنے والوں نے ہر اخلاقیات سے بالاتر ہوکر براہ راست فوجی اقدام کر ڈالا۔ یہ اکیسویں صدی کی مہذب دنیا اور اس کے حواریوں کے منہ پر کھلا طمانچہ ہے۔

مصر کے حالات پر مغربی میڈیا کی متعصّبانہ اور غیر حقیقی رپورٹیں زخموں پر نمک پاشی کرتی رہیں۔ ثبوت نہ ملنے کے باوجود مظاہرین کو مسلح ثابت کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ عوامی مجمعے کو دہشت گردوں کے کیمپ بھی کہا گیا۔ اخوان المسلمون کو آمرانہ حکومتوں کے خلاف ماضی کی مسلح جدوجہد کے طعنے بھی دیئے، مگر پھر بھی یہ رپورٹیں شہریوں کے خلاف فوج کے ان مظالم کا دفاع کرنے میں ناکام رہیں۔ ''رابعہ'' کا زندگی بخش نشان ہر دل کی دھڑکن بن کر ہر سینے پر سج گیا اور آزادی، جدوجہد اور کامیابی کی علامت بن کر راتوں رات دنیا بھر میں پھیل گیا۔

امریکہ اور اس کے حواری القاعدہ کو اپنا دشمن نمبر ایک کہتے ہیں اور القاعدہ کے خاتمے کو مرکزی نکتہ قرار دے کر اسکے گرد اپنے تمام عالمی ایجنڈے کو تشکیل دیتے ہیں۔ جبکہ ''تہذیبوں کا تصادم'' اور اس نوعیت کی دوسری دستاویزات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ امریکہ کی اصل حریف احیائے اسلام کی تحریکیں ہیں جو دنیا بھر میں آئینی جدوجہد کے ذریعے تبدیلی پر یقین رکھتی ہیں۔ سیاسی اسلام کا تصور خود مغرب کے وضع کردہ جمہوری نظام، آزادیِ رائے اور آزادیِ اظہار کے ماحول میں پنپتا ہے اور عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کے جوہر سے مالا مال ہے۔ اسی لئے جس جگہ بھی جمہوری نظام کے نتیجے میں اسلام پسند قوتیں برسر اقتدار آتی ہیں امریکہ اور اس کے حواری اپنے

ایجنٹوں کے ذریعے عوامی مینڈیٹ کی پروانہ کرتے ہوئے ان حکومتوں کو معطل کروادیتے ہیں۔ مصر میں ہونے والا ظلم اخوان المسلمون جیسی بہادر اور جہادی ماضی رکھنے والی تنظیم کو ہتھیار اٹھانے کی ترغیب دینے کے سوا کچھ نہیں۔ امریکہ لاکھ القاعدہ کو اپنا دشمن کہے، مگر گزشتہ بارہ برس کے حالات گواہی دے رہے ہیں کہ القاعدہ جو بھی ہے، امریکی مفادات کے تسلسل کے لئے اس کا وجود بے حد ضروری ہے تاکہ اس کے بہانے امریکہ مسلم ملکوں پر فوج کشی اور ان کے وسائل کی لوٹ مار کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ اس کے مقابلے میں جمہوری اسلام پسند قوتیں امریکہ کے لئے موت کا پیغام ہیں کیونکہ وہ مغرب کو اسی کی زبان میں جواب دینا اور اقتدار میں آکر اس کے عالمی مفادات پر ضرب لگانا جانتی ہیں۔

مصر میں سیکڑوں جمہوریت پسندوں کے قتلِ عام پر پاکستانی میڈیا کی مجرمانہ خاموشی ایک اور سانحہ ہے۔ بلکہ جس دن وہاں چھ سو لوگوں کا قتل عام ہوا اور رابعہ العدویہ خون میں نہایا پڑا تھا، اس دن دوپہر سے یہاں ایک اور تماشے پر کیمرے فکس کر کے اہل پاکستان کو لائیو انٹرٹین منٹ مہیا کی جارہی تھی ''سکندر کا مقدر'' نامی اس ایکشن اور سسپنس سے بھرپور فلم کی چھ گھنٹے کی کوریج اور بعد ازاں چوبیس گھنٹے اس پر لایعنی دانشوری بگھارنے کے لئے ہمارا الیکٹرانک میڈیا وقف رہا جہاں ایک ایک منٹ کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ ٹی وی چینلوں کی جانب سے اتنی سخاوت کے ساتھ وقت کی اس ''خیرات'' پر بھی سوالات اٹھ رہے ہیں۔

ایسے واقعات ترقی یافتہ ممالک میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی بھی ہتھیار بردار شخص نہتے شہریوں کو یرغمال بنالیتا ہے یا کھلی فائرنگ کر کے سکول کے بچوں کو مار ڈالتا ہے، مگر ان کے میڈیا میں کوئی ان واقعات کی بنیاد پر حکومت کی رٹ نہ ہونے کی بات کر کے ملک کو بدنام کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہمارے ایک سینئر اینکر پرسن نے اس واقعے کی بنیاد پر حکومت کی رٹ پر سوالات اٹھانے شروع کر دیئے۔ یہ رویہ لاعلمی سے بڑھ کر بدنیتی پر مبنی محسوس ہوا کیونکہ موصوف پاکستان میں امریکی پالیسیوں کا دفاع کرنے والے گروہ کے سرخیل مانے جاتے ہیں۔

ادھر شام میں حکومت نے اپنے شہریوں پر کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال شروع کر کے امریکہ کو جنگی اقدام کا بہانہ دے دیا ہے۔ بیروت اور طرابلس میں طاقتور بم دھماکوں سے بے حد جانی نقصان ہوا ہے۔ ساری عرب دنیا سلگ رہی ہے۔ ایسے میں سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کی بے حسی نے مسلمانوں کے سر جھکا دیئے ہیں۔ جبکہ امام کعبہ نے امہ کے جذبات کی ترجمانی کی۔ سعودی عرب کے ۵۶ علماء نے بھی تیرہ نکات پر مبنی تفصیلی مشترکہ اعلامیہ میں کلمہ حق کہنے کا حق ادا کیا ہے جو عرب حکمرانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ ترکی کے صدر اور عوام نے دینی حمیت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ مصر میں ظلم کے خلاف ترکی میں ہزاروں افراد نے ریلی میں شرکت کی۔ پاکستان میں یہ توفیق صرف جماعت اسلامی کے حصے میں آئی۔

وطن عزیز بارشوں اور بھارت کی آبی جارحیت کے نتیجے میں سیلابوں کا شکار ہے۔ دریائی علاقوں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ دربدر ہوگیا ہے۔ گھر اور مویشی بہہ گئے اور کھڑی فصلیں تباہ ہوگئی ہیں۔ دریاؤں میں سیلاب آنا کوئی ایسا خرق عادت واقعہ نہیں جس کی پیش بندی نہ کی جاسکے۔ یہ تو ہر سال کا معاملہ ہے، مگر ہمارے ہاں ناقص منصوبہ بندی یا سرے سے منصوبہ بندی کے فقدان کے باعث عوام قدرتی آفات کے رحم وکرم پر رہتے ہیں۔ چند بارشوں نے کراچی شہر کو بھی ڈبو دیا اور ساتھ ہی کراچی کی ترقی کے دعوؤں کو بھی غرق آب کر دیا۔

لائن آف کنٹرول پر بھارت کی بلا اشتعال فائرنگ سے ایک فوجی افسر اور تین جوان شہید ہوگئے جبکہ ہمارے وزیراعظم عوام کو پرسکون رہنے اور بھارت سے تعلقات اچھے رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ گزشتہ ماہ بھارت میں دوستی بس رکوا کر جس واقعے پر پاکستان کے خلاف نعرے بازی کی گئی وہ خود بھارت کا کارنامہ نکلا، مگر ہم اپنے ناکردہ جرائم پر ہی شرمندہ شرمندہ رہتے ہیں۔ کوئی دبنگ لہجہ بھارت کی ہرزہ سرائیوں کو لگام دینے اور پاکستان کا دفاع کرنے والا نہیں۔

دیامیر کے افسوسناک واقعے میں ملوث مجرم پکڑے گئے مگر ان کا سراغ لگانے والے فوجی و پولیس افسران کو جان کی قربانی دینی پڑی۔ غیرملکی ایجنسی سے رقم لے کر یہ دہشت گردانہ کارروائی کرنے والوں کا اصل نشانہ ایرانی سیاحوں کی ٹیم تھی اور واقعے کو فرقہ وارانہ رنگ دینا مقصود تھا مگر یورپی سیاح اس حملے کی زد میں آ گئے۔ ان مجرموں کے بارے میں اصل معلومات عوام کے سامنے آنی چاہئیں جنہیں ایسے ایشوز پر گھڑے گھڑائے جواب پیش کر دیئے جاتے ہیں اور ہر واقعے کو طالبان یا مذہبی انتہاپسندی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

ایک واقعہ بھکر میں ہوا ہے جس کو بھی فرقہ واریت کا رنگ دیا گیا ہے۔ اگلے ہی دن کراچی میں مولانا اکبر سعید فاروقی کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک منظّم منصوبے کے تحت پاکستان میں عراق کی طرح شیعہ سنی اور بھارت کی طرح اقلیتوں کے فسادات کی آگ بھڑکائی جارہی ہے۔

اقتدار کے دو ماہ پورے ہونے کے باوجود حکومت قومی سلامتی کے نازک معاملات اور شہریوں کو درپیش سنگین مسائل پر کوئی واضح حکمت عملی وضع نہیں کرسکی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کرے اور ہمیں ہدایت دے آمین۔

دعاگو

صائمہ اسما

ڈاکٹر مقبول احمد شاہد

قرآن کا معجزہ

وہ کتاب جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی کتاب نہیں لائی جاسکتی، جو زبان وادب کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور تعلیم وحکمت کے لحاظ سے بھی

۸۔قرآن کی اثر انگیزی:

قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے اس کے ادب کا وہ بلند ترین اور مکمل ترین نمونہ ہے۔ پوری کتاب میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی معیار سے گرا ہوا نہیں ہے۔ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا ہے اور ہر مرتبہ پیرایۂ بیان نیا ہے۔ اول سے لے کر آخر تک ساری کتاب میں الفاظ کی نشست ایسی ہے جیسے نگینے تراش تراش کر جڑے گئے ہوں۔کلام اتنا اثر انگیز ہے کہ کوئی زبان دان آدمی اسے سن کر سر دھنے بغیر نہیں رہ سکتا حتیٰ کہ منکر ومخالف کی روح بھی وجد کرنے لگتی ہے۔قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصہ ہے اس کے ادب کا حصہ بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل بھی پگھلا دیتی تھی۔جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہلا دی تھی جس کی قوت تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالف تک مانتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ جادو اثر کلام جو سنے گا بالآخر نقد دل ہار بیٹھے گا۔

اس لیے کفار قریش نے نبی کریمؐ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے جہاں اور بہت سی چالیں چلیں وہاں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا کہ آپ جو کلام وحی لے کر آئے تھے وہ لوگ سننے نہ پائیں۔ یہی بات قرآن کریم میں اس طرح بیان کی گئی:

''یہ منکرین حق کہتے ہیں،اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو،شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ۔''

(حم سجدہ ۲۶)

لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹانے کے لیے کفار مکہ نے ایک اور تدبیر بھی کی جس کا سورہ لقمان میں اس طرح ذکر ہے:

''اور انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو لہو الحدیث (کلام دلفریب) خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے۔ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔''(لقمان ۶)

لہوالحدیث کا مطلب ہے خرافات،ہنسی مذاق،گانا بجانا،فحش افسانے اور ناول، داستانیں قصے وغیرہ۔اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کفار مکہ کی ساری کوششوں کے باوجود پھیلتی جارہی تھی تو قریش کے ایک سردار نضر بن حارث نے قریش

کے لوگوں سے کہا کہ جس طرح تم اس شخص کا مقابلہ کر رہے ہو اس سے کام نہیں چلے گا۔ یہ شخص تمھارے درمیان بچپن سے ادھیڑ عمر کو پہنچا ہے۔ آج تک وہ اپنے اخلاق میں تمھارا سب سے بہتر آدمی تھا۔ سب سے سچا اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے، آخر ان باتوں کو کون باور کرے گا۔ کیا لوگ ساحروں کو نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کی جھاڑ پھونک کرتے ہیں؟ کیا لوگوں کو معلوم نہیں کہ کاہن کس قسم کی باتیں بنایا کرتے ہیں؟ کیا لوگ شعر و شاعری اور جنوں کی کیفیات سے ناواقف ہیں؟ ان الزامات میں سے آخر کون سا الزام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں ہوتا ہے جو کہ اس کا یقین دلا کر تم عوام کو ان کی طرف توجہ کرنے سے روک سکو گے؟ ٹھہرو، اس کا علاج میں کرتا ہوں .....اس کے بعد وہ مکہ سے عراق گیا، اور وہاں سے شاہان عجم کے قصے اور رستم و اسفند یار کی داستانیں لاکر اس نے قصہ گوئی کی محفلیں برپا کرنی شروع کر دیں تا کہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹے اور وہ ان کہانیوں میں کھو جائیں۔ (سیرت ابن ہشام)۔ ابن عباسؓ نے اس پر مزید اضافہ یہ کیا ہے کہ نضر بن حارث نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کے متعلق وہ سنتا کہ نبی کریمؐ کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے اس پر اپنی ایک لونڈی مسلط کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گانا سنا تا کہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل اُدھر سے ہٹ جائے۔

o کفار کی اس تدبیر کا نتیجہ تھا کہ نبی کریمؐ کو نبوت عطا ہونے کے بعد پانچ سال تک کسی مجمع عام میں قرآن سنانے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ کفار کی سخت مزاحمت اس میں مانع تھی۔ پانچ سال بعد رمضان ۵ ہجری میں ایک روز آپؐ حرم پاک میں جہاں قریش کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا یکا یک تقریر کرنے کھڑے ہو گئے اور اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورہ نجم کی صورت میں آپ کی زبان پر خطبہ جاری ہو گیا۔ اس کلام کی تاثیر کا یہ حال تھا کہ جب آپ نے اسے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس پر شور مچانے کا ہوش ہی نہ رہا اور جب اس سورہ کا آخری سجدے کی آیت پر اختتام ہوا تو نبی کریمؐ نے سجدہ فرمایا تو آپ کے ساتھ سارے کفار بھی سجدے میں گر گئے۔ (بخاری و مسلم) یہ قرآن کی اثر انگیزی کا صریح معجزہ تھا۔

o حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ بھی قرآن کی اثر انگیزی کا نتیجہ تھا۔ ان کے ایمان لانے کی سب سے زیادہ مشہور اور معتبر روایت یہ ہے کہ جب وہ نبی کریمؐ کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے تو راستے میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تمھاری اپنی بہن اور بہنوئی اس نئے دین میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ سیدھے اپنی بہن کے گھر پہنچے۔ وہاں ان کی بہن فاطمہؓ بنت خطاب اور بہنوئی سعیدؓ بن زید بیٹھے ہوئے حضرت خبابؓ بن ارت سے ایک قرآنی صحیفے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے آتے ہی ان

کی بہن نے صحیفہ فوراً چھپا لیا۔ مگر حضرت عمرؓ اس کے پڑھنے کی آواز سن چکے تھے۔ انھوں نے پہلے کچھ پوچھ گچھ کی، اس کے بعد بہنوئی پر پل پڑے اور مارنا شروع کر دیا۔ بہن نے بچانا چاہا تو انھیں بھی مارا یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ آخر کار بہن اور بہنوئی نے کہا ہاں ہم مسلمان ہو چکے ہیں تم سے جو کچھ ہو سکے کر لو۔ حضرت عمرؓ اپنی بہن کا خون بہتے دیکھ کر کچھ پشیمان سے ہو گئے اور کہنے لگے، مجھے بھی وہ چیز دکھاؤ جو تم پڑھ رہے تھے۔ بہن نے پہلے قسم لی کہ وہ اسے پھاڑ نہ دیں گے۔ پھر کہا کہ تم جب تک غسل نہ کر لو اس پاک صحیفے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ حضرت عمرؓ نے غسل کیا اور پھر وہ صحیفہ لے کر پڑھنا شروع کیا جس میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ پڑھتے پڑھتے ان کی زبان سے نکلا، ''کیا خوب کلام ہے۔'' یہ سنتے ہی حضرت خبابؓ بن ارت جو ان کی آہٹ پاتے ہی چھپ گئے تھے، باہر آ گئے اور کہا کہ ''بخدا، مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے دین کی دعوت پھیلانے میں بڑی خدمت لے گا۔ کل ہی میں نے نبی کریمؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ خدایا ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطاب، دونوں میں سے کسی کو اسلام کا حامی بنا دے۔ پس اے عمر اللہ کی طرف چلو، اللہ کی طرف چلو۔'' اس فقرے نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور اسی وقت حضرت خبابؓ کے ساتھ جا کر حضرت عمرؓ نے نبی کریمؐ کی خدمت میں اسلام قبول کر لیا۔ یہ ۵ ہجری میں ہجرت حبشہ سے تھوڑی مدت بعد ہی کا قصہ ہے۔

○ اسی طرح حضرت جبیر بن مطعم کے ایمان لانے کا واقعہ وہ خود اس طرح بیان کرتے ہیں کہ میں مسلمان ہونے سے پہلے ایک مرتبہ مدینہ طیبہ اس لیے آیا کہ رسول اللہؐ سے جنگ بدر کے ان ستر قیدیوں کے بارے میں گفتگو کروں جو اس وقت آپ کی تحویل میں تھے۔ میں مسجد نبوی کے باہر پہنچا تو رسول اللہؐ مغرب کی نماز میں سورہ طور کی تلاوت فرما رہے تھے اور آواز مسجد سے باہر پہنچ رہی تھی۔ جب یہ آیات پڑھیں۔ '**ان عذاب ربک لواقع ماله من دافع**' (بلاشک تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں) تو اچانک میری یہ حالت ہوئی کہ گویا میرا دل خوف سے پھٹ جائے گا۔ میں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ مجھے اس وقت یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس جگہ سے ہٹ نہیں سکوں گا کہ مجھ پر عذاب آ جائے گا۔'' (قرطبی)

○ نبی کریمؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق مشہور تابعی محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجد حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہؓ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس موقع پر ایک سردار قریش عتبہ بن ربیعہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر

آپ لوگ اجازت دیں تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اوران کے سامنے چند تجویزیں رکھوں۔ شاید وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آ جائیں۔سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور عتبہ اٹھ کر نبی کریمؐ کے پاس جا بیٹھا۔ آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا ''بھتیجے تم اپنی قوم میں اپنے نسب اور خاندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہو وہ تمھیں معلوم ہے، مگر تم اپنی قوم پر بڑی مصیبت لے آئے ہو۔تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ساری قوم کو بے وقوف ٹھہرایا۔قوم کے دین اوران کے معبودوں کی برائی کی اور ایسی باتیں کرنے لگے جن کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے۔اب ذرا میری بات سنو، میں کچھ تجویزیں تمھارے سامنے رکھتا ہوں، ان پر غور کرو۔شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کرلو۔''

رسول اللہؐ نے فرمایا ''ابوالولید! آپ کہیں، میں سنوں گا۔''

اس نے کہا ''بھتیجے یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے اگر تمھارا مقصد مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ۔اگر اس سے بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں، کسی معاملہ کا فیصلہ تمھارے بغیر نہ کریں گے۔اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطباء بلاتے ہیں اور اپنے خرچ پر تمھارا علاج کراتے ہیں۔''

عتبہ یہ باتیں کر رہا تھا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔پھر آپ نے فرمایا۔''ابوالولید آپ کو جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے؟''

اس نے کہا ''ہاں''۔

آپ نے فرمایا، ''اچھا اب میری سنو۔'' اس کے بعد آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورہ حم السجدہ کی تلاوت شروع کی۔عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیک کر غور سے سنتا رہا۔آیت سجدہ (آیت نمبر ۳۸) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا ''اے ابوالولید، آپ نے میرا جواب سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔'' عتبہ اٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس میں چلا تو لوگوں نے دور سے اس کو دیکھتے ہی کہا، خدا کی قسم عتبہ کا چہرا بدلا ہوا ہے۔یہ وہ صورت نہیں جسے لے کر یہ گیا تھا۔پھر وہ جب آ کر بیٹھا۔لوگوں نے کہا، کیا سن آئے؟ اس نے کہا، ''بخدا میں نے ایسا کلام سنا جو اس سے پہلے نہ سنا تھا۔خدا کی قسم نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے، نہ کہانت۔اے سردارانِ قریش میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام کچھ رنگ لا کر رہے گا۔فرض کرو، اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو تم اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔لیکن اگر وہ غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمھاری بادشاہی اور اس کی

عزت تمھاری عزت ہی ہوگی۔'' سردارانِ قریش اس کی بات سنتے ہی بول اٹھے۔''اے ابوالولید آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔'' عتبہ نے کہا''میری جو رائے تھی وہ میں نے تمھیں بتا دی، اب تمھارا جو ہی چاہے کرتے رہو۔''

o اللہ تعالیٰ نے قرآن کی اثر انگیزی کی ایک اور مثال ایک بے جان چیز پہاڑ کے متعلق دی ہے جسے ہم پوری طرح محسوس تو نہیں کر سکتے لیکن اس سے قرآن کی عظمت اور رب کریم کے جلال کا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں۔فرمایا:

''اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ ان پر غور کریں۔''

(الحشر ۲۱)

یہی بات دوسری جگہ قرآن مجید میں اس طرح کہی گئی:

''ہم نے اس امانت (قرآن) کو آسمانوں، زمین ، اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔''(الاحزاب ۷۲)

۹۔قرآن سے لوگوں کی محبت:

قرآن کریم نازل ہونے کے بعد اب تک انسانوں کی ایک کثیر آبادی کے لیے انتہائی محبوب و محترم کتاب رہی ہے اور قیامت تک یہی صورت حال برقرار رہے گی۔ دنیا کی کسی اور کتاب کو یہ مقام حاصل نہیں ہے۔ مسلمان اسے ادب و احترام سے خوب صورت غلافوں میں اونچی جگہ رکھتے ہیں۔اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ اسے زمین پر نہ رکھا جائے، اور اس کے اوپر اور کوئی کتاب نہ رکھی جائے۔ اگر کہیں ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر جائے تو اسے فوراً اٹھا کر چومتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ ناپاکی کی حالت میں اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے اور کھول کر پڑھنے سے پہلے وضو کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔اس ادب و احترام کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں اس کتاب کی عظمت متعدد مقامات پر بیان فرمائی ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

''پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی، اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن (قرآن کریم) ہے ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔''(الواقعہ ۷۵تا۷۹)

''بلکہ یہ قرآن بڑی شان والی کتاب (قرآن مجید) ہے، اس لوح میں نقش ہے جو محفوظ ہے۔'' (البروج ۲۱،۲۲)

''اور ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں

جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں اور تمھیں عظمت والا قرآن (قرآن عظیم) عطا کیا ہے۔'' (الحجر ۸۷)

''ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے (کتاب شفا و رحمت) مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔'' (بنی اسرائیل ۸۲)

خود قرآن میں اس کتاب کے ادب و احترام کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے:

''جب قرآن تمھارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' (الاعراف ۲۰۴)

(جاری ہے)

☆☆☆

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن کلام

قولِ حسن کی بہترین عملی مثال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ گفتار ہے۔ آپ کی گفتگو نہایت پاکیزہ اور فصیح و بلیغ الفاظ پر مشتمل ہوتی۔ آپؐ جب خطبہ ارشاد فرماتے تو انتہائی وضاحت کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات بیان فرماتے۔ اہم نکات کو کم سے کم تین مرتبہ دہراتے۔ آپ مخاطب کی اچھی بات پر تحسین فرماتے، اسے خود سے مانوس کرنے کے لیے اپنے قریب کر لیتے، کبھی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے۔ کندھے سے پکڑتے، سر کو چھوتے اپنے ساتھ سواری پر بٹھا لیتے۔ اس کے لیے دعا کرتے۔

ہر حال اور ہر مقام میں آپ کی حسن گفتگو کا اعلیٰ معیار برقرار رہا۔ غم، غصہ، پریشانی، خوشی، بے تکلفی، تنہائی، تخلیہ، کسی حال میں زبان مبارک سے کوئی ایسی بات نہ نکلی جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرے۔ کسی کی دلآزاری کی موجب ہو، بے صبری یا عدم برداشت جھلکتی ہو۔

حضرت عائشہؓ آپؐ کے تکلم کے بارے میں فرماتی ہیں:

''آپ بروئے عادت سخت گو نہ تھے، اور نہ بتکلف سخت گو بنتے تھے۔ نہ بازاروں میں خلاف وقار باتیں کرنے والے تھے۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے، بلکہ معاف فرما دیتے، غایت حیا سے آپ کی نگاہ کسی کے چہرے پر نہ پڑتی تھی۔ کسی نامناسب بات کا کسی ضرورت سے ذکر کرنا ہی پڑتا تو کنایہ میں فرماتے۔''

آپ کا کلام جامع ہوتا، الفاظ مختصر مگر معنی وسیع ہوتے محکم اور مدلل فقرے دلوں میں اترتے چلے جاتے۔ نہ کم گو تھے کہ ضروری بات میں بھی سکوت فرمائیں اور نہ زیادہ گو کہ غیر ضروری امور میں مشغول ہوں۔

گفتگو ایسی کہ گویا موتی کے دانے پروئے گئے ہوں۔ آپ کی ہنسی تبسم کی حد تک تھی۔ غصہ آتا تو منہ پھیر لیتے، خوش ہوتے تو نظر نیچی کر لیتے۔ درشت گو نہ تھے۔ چلا کر بولتے نہ نامناسب بات فرماتے۔ کسی شخص کی کوئی بات آپ کی طبیعت کے خلاف ہوتی تو اس کو نظر انداز کر دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ کسی کی مذمت نہ فرماتے، کسی کا عار نہ دلاتے، کسی کا عیب تلاش نہ کرتے۔ کسی شخص کی بات بیچ میں نہ کاٹتے۔

تبسم فرمانے اور خوش مزاجی میں سب سے بڑھ کر تھے۔آپؐ کی بات ہمیشہ برمحل ہوتی۔

محفل میں آپؐ اپنے گھر والوں اور ساتھیوں کے ساتھ ایک بے تکلف دوست اور خوش مزاج ساتھی کی حیثیت سے میل جول رکھتے تھے۔ پیار محبت کی باتیں ہوتیں، ادھر ادھر کے قصے یا گزرے ہوئے واقعات بیان کیے جاتے۔ آپؐ دوسروں کی باتیں دلچسپی سے سنتے اور خود بھی اپنے گزشتہ واقعات سناتے۔ازواجِ مطہرات آپؐ کی موجودگی میں ہنسی، دل لگی کرتیں تو آپ بھی لطف اندوز ہوتے۔ اپنے سامنے اپنی مدح وتعریف پسند نہ فرماتے۔ البتہ کوئی شکر گزاری اور احسان مندی کا اظہار کرتا تو ایک حد تک گوارا فرماتے۔

ناپسندیدہ قول (قولِ غیر حَسَن)

ایسی تمام باتیں ناپسندیدہ ہیں جن سے اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے۔ذیل میں کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں:

جھوٹ:

سورۃ الحج آیت نمبر ۳۰ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ۔

''پس تم بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو۔''

سورۃ المومن آیت ۲۸ میں فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ

''اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا، بہت جھوٹ بولنے والا ہو۔''

حضرت عبداللہؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''سچائی نیکی کی طرف ہدایت دیتی ہے، اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔انسان سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ صدیق (بہت سچا) ہو جاتا ہے۔ اور بے شک جھوٹ بدکاری کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور بدکاری دوزخ میں لے جاتی ہے، اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا کے ہاں کذاب (بہت جھوٹا) لکھا جاتا ہے۔(بخاری)

حضرت ابوبکر صدیقؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا کیا میں تمھیں بڑے (کبیرہ) گناہوں میں سے بڑے گناہ نہ بتا دوں؟ صحابہ نے عرض کیا، کیوں نہیں یا رسول اللہؐ! آپؐ نے فرمایا کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور حضورؐ ٹیک لگائے ہوئے تھے پھر (سیدھے ہو کر) بیٹھ گئے اور فرمایا کہ آگاہ ہو کہ جھوٹی بات کرنا۔ پھر آپ اس بات کو دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم نے اپنے جی میں کہا کہ کاش اب آپ خاموش ہو جائیں۔(مسلم)

بہز بن حکیم بیان کرتے ہیں کہ میرے باپ نے

میرے دادا سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ ''ہلاکت ہے اس کے لیے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے کوئی بات کرتا ہے اور اس میں جھوٹ بولتا ہے، اس کے لیے ہلاکت ہے، اس کے لیے ہلاکت ہے۔'' (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کی بو کے باعث اس سے ایک میل دور ہو جاتا ہے۔ (ترمذی)

جھوٹ میں افواہیں پھیلانا بھی شامل ہے یعنی کسی بات کی تحقیق کیے بغیر وہ بات لوگوں میں پھیلا دینا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے (اس کے صحیح یا غلط ہونے کی تحقیق کیے بغیر) اُسے دوسروں تک پہنچا دے۔ (مسلم)

غیبت، بہتان، چغلی:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''کوئی کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔'' (الحجرات ۱۲)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ کرام سے) فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟

صحابہ نے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ (غیبت یہ ہے کہ) تو اپنے بھائی کا ذکر اس طریقے سے کرے جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ اگر ہمارے بھائی میں وہ بات واقعی پائی جاتی ہو جو ہم نے کہی ہو (تو کیا پھر بھی یہ غیبت ہو گی؟) آپؐ نے فرمایا کہ اگر تمھاری کہی ہوئی بات اس میں پائی جاتی ہو تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ اس میں نہ پائی جاتی ہو تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔

یعنی پیٹھ پیچھے کسی کی بدگوئی کرنا مطلقاً حرام ہے، یہ بدگوئی اگر سچی ہے تو غیبت ہے، جھوٹی ہے تو بہتان ہے، اور دو آدمیوں کو لڑانے کے لیے ہو تو وہ چغلی ہے۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''مسلمان کی غیبت نہ کرو، نہ ان کے عیوب کے پیچھے پڑو جو کوئی اپنے بھائی کے عیب کے پیچھے پڑے گا تو اللہ اس کے عیوب کے درپے ہو گا اور اس کو اس کے گھر کے اندر رسوا کر دے گا۔''

(ابوداؤد)

چلّا کر بولنا:

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ

''اپنی آواز ذرا پست رکھ! سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔(لقمان ۱۹)

چلا کر بولنا، اونچی آواز میں بات کرنا کبھی بھی پسندیدہ نہیں ہے، یہ انسانی وقار کے خلاف ہے۔ خصوصاً عمر اور مرتبہ میں بڑوں کے سامنے زور سے بولنا ایک ناشائستہ حرکت ہے۔

فحش گوئی اور گالی گلوچ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' (النور ۱۹)

''اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے، اور فحاشی، بدی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔'' (النحل ۹۰)

بدزبانی، بدکلامی، گالی گلوچ، جھوٹا پروپیگنڈا، جرائم کی تشہیر سب فحاشی میں شامل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''منافق کی یہ نشانی ہے کہ جب کسی سے جھگڑا ہو بیہودہ گوئی پر اتر آئے۔'' (بخاری)

حضورؐ اس معاملے میں اتنے محتاط تھے کہ شریروں کی شرارت کے جواب میں بھی سخت کلامی کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ کو اور آپ کے ساتھی مومنین کو مخالفین نے طرح طرح سے ستایا، گالیاں دیں، بدزبانی کی، لیکن آپؐ کی طرف سے کبھی سخت کلامی سے جواب نہیں دیا گیا۔

آپؐ نے فرمایا:

''آپس میں گالی دینے والے دو شخص جو کچھ ایک دوسرے کو کہیں گے اس کا گناہ ابتدا کرنے والے کو ہوگا یہاں تک کہ مظلوم زیادتی کا ارتکاب نہ کرے۔'' (صحیح مسلم)

ایک موقع پر ایک اعرابی نے عرض کیا کہ ایک آدمی جو رتبہ میں مجھ سے کم ہے مجھے گالیاں دیا کرتا ہے تو کیا میں اس سے بدلہ لے لوں؟ آپؐ نے فرمایا:

''گالی گلوچ کرنے والے دونوں شیطان ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو جھٹلاتے اور تہمت لگاتے ہیں۔''

لعنت اور ملامت:

لعنت اور ملامت بھی گالی ہی قسم میں ہیں۔

لعنت کرنا کسی حال میں روا نہیں، اس معاملہ میں انسان، حیوان، اور جمادات سب برابر ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے اس معاملہ میں کبھی رعایت سے کام نہ لیا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص حضورؐ کے ہمراہ اونٹ پر جا تا تھا۔ اس نے اپنے اونٹ پر لعنت کی تو آپؐ نے انتہائی ناگواری کا اظہار

کرتے ہوئے فرمایا: ''اے عبداللہ! ملعون اونٹ پر ہمارے ساتھ مت چلو۔'' اور یہ اس لیے فرمایا کہ لوگ جان لیں کہ ایسی بات انتہائی معیوب ہے۔

لعنت اس قدر ناپسندیدہ لفظ ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے اس کے لیے اللہ رب العزت کی ناراضگی ان الفاظ میں بیان فرمائی:

''بندہ جب کسی چیز پر لعنت کرتا ہے تو لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے لیکن اس کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ پھر وہ زمین کی طرف اترتی ہے تو اس کے دروازے بھی اس کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں۔ پھر دائیں اور باتیں رخ کرتی ہے پھر جب کوئی گنجائش باقی نہیں پاتی تو اس کی طرف لوٹتی ہے جس پر لعنت کی گئی تھی۔ پس اگر وہ اس لعنت کا مستحق ہو تو اس پر پڑتی ہے ورنہ وہ لعنت کرنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔'' (ابوداؤد)

طعنہ زنی:

طعن عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے نیزہ مارنا۔ کیونکہ طعنہ سن کر دل کو شدید تکلیف ہوتی ہے گویا کسی نے نیزہ مار دیا ہو اس لیے اس عمل بد کو طعنہ کہا جاتا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ

''اور آپس میں ایک دوسرے کو طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔'' (الحجرات ۱۱)

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ

''تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن کرے اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرتا پھرے۔'' (الہمزہ:۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مومن طعنہ زنی کرنے والا ہوتا ہے، نہ لعنت کرنے والا، نہ فحش بکنے والا اور نہ فضول گوئی اور زبان درازی کرنے والا۔''

(مسلم)

نوحہ کرنا:

زبان کا ایک بڑا ناپسندیدہ استعمال میت پر نوحہ کرنا ہے۔ آنسو بہانا ایک قدرتی امر ہے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ خود حضورؐ نے اپنی عزیز ہستیوں کی وفات پر آنسو بہائے ہیں مگر زبان کے معاملے میں یہی حکم ہے کہ اس سے کوئی ایسی بات نہ نکالی جائے جو اللہ کے حضور میں ناپسندیدہ ہو۔ جب اسلام آیا تو جہاں جاہلیت کی اور بہت سی فضول رسوم ممنوع ٹھہرائی گئیں، اس طرح نوحہ کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ حضرت ام عطیہؓ بیان کرتی ہیں کہ ہم خواتین نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو آپؐ نے ہم سے شرک سے بچنے کے علاوہ نوحہ نہ کرنے کا بھی وعدہ لیا۔ (بخاری)

مدح سرائی، خوشامد، چاپلوسی:

حضرت ابوبکرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کسی شخص نے کسی (اور) شخص کی تعریف کی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ تیری بربادی ہو تو نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ ڈالی۔ آپؐ نے ان کلمات کو تین مرتبہ فرمایا۔ (پھر فرمایا) اگر تم میں سے کسی نے (کسی کی) ضرور ہی تعریف کرنی ہو تو اگر وہ اسے جانتا ہے تو یوں کہے کہ میں (اسے) ایسا اور ایسا گمان کرتا ہوں اور اللہ اس کا نگران ہے اور میں اللہ کے سامنے کسی کو پاک نہیں ٹھہراتا۔ (بخاری)

جس تعریف کی حضورؐ نے اس طرح ممانعت فرمائی ہے، یہ وہ تعریف ہے جس میں مبالغہ ہوتا ہے، جو خوشامد اور چاپلوسی کا پہلو لیے ہوتی ہے اور جس سے سننے والے کے دل میں کبر اور غرور پیدا ہوتا ہے جو بالآخر اسے تباہ کر دیتا ہے۔ باقی کسی کا دل بڑھانے کی خاطر اسے شاباش دینا یا اعتدال کے ساتھ صحیح تعریف کر دینے میں حرج نہیں۔ حضورؐ نے خود بھی قابل تعریف لوگوں کی تعریف فرمائی ہے۔

مضحکہ اڑانا:

ارشادِ خداوندی ہے:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ (اللہ کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (اللہ کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں۔'' (الحجرات ۱۱)

بعض دوسری ناپسندیدہ (غیر حَسَن) باتیں

☆ کسی کو من کو کافر کہنا۔ ☆ فخر اور تکبر کا اظہار کرنا۔ ☆ مسخرا پن۔ ☆ بیہودہ مذاق اور دل لگی۔ ☆ کسی کی نقل اتارنا۔ ☆ الفاظ کو اس طرح ادا کرنا جس سے ان کے معنی بدل جائیں جیسے نبی کریمؐ کی محفل میں یہود کا طریقہ تھا۔ ☆ مجلس کے راز افشا کرنا۔ یا ایسا راز جس کے افشا نہ کرنے کا کسی سے وعدہ کیا ہو۔ ☆ دوسروں کی بات کاٹنا۔ ☆ بزرگوں کے سامنے گستاخانہ گفتگو۔

(جاری ہے)

☆☆☆

فریدہ خالد

غصہ پر قابو پایئے

قرآن وسنت اور سائنس کی روشنی میں چند رہنما اصول

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ بندوں کی ایک خصلت یہ بتائی ہے کہ وہ ''غصہ کو پی جانے والے ہوتے ہیں۔''(آل عمران:۱۳۴)۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسے لوگ اللہ کے نزدیک اتنے پسندیدہ کیوں ہوتے ہیں اور یہ کہ ہم اپنے غصے پر کس طرح قابو پا سکتے ہیں تا کہ ہم بھی اللہ کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہو جائیں؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہم غصہ اور اس پر قابو پانے کے عمل کو قرآن وسنت اور سائنس کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مطالعہ کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ غصہ ایک فطری مگر بہت طاقتور جذبہ ہے اور اس پر قابو پانا انسانی جیت ہے۔ کسی کی بات بری لگنے پر آپے سے باہر ہو جانا، دوسروں کو برا بھلا کہنا، چیخنا چلانا اور جھگڑا کرنا وغیرہ سب غصے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ بقول مولانا وحید الدین ''غصہ ہمیشہ اس وقت آتا ہے جب کوئی آپ سے غصہ دلانے والی بات کرے'' (دین انسانیت صفحہ ۷۵) یہ معمولی چڑ چڑے پن سے شروع ہو کر شدید غیض وغضب تک پہنچ سکتا ہے لہٰذا اس پر شروع ہی میں قابو پانے کی کوشش کرنی ضروری ہے۔ دیانند ورما اپنی کتاب 'ہماری عادتیں ہمارے جذبات' میں لکھتے ہیں کہ ''ہماری مرضی کے مطابق کام نہ ہونے پر ہمارے اندر ایک خاص قسم کی گلٹی میں سے مادہ بہنے لگتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر ہمارے خون میں شکر کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ خون کا دوران تیز ہو جاتا ہے اور اسی تیزی کی وجہ سے ہم خود کو مضبوط، توانا اور طاقتور سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لمحاتی قوت کی وجہ سے ہمیں اس وقت اس بات کا علم نہیں رہتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔'' (صفحہ ۶۵) اسی سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''شروعات سے پیشتر غصہ ہمارا غلام ہوتا ہے لیکن بعد میں ہم اس کے غلام بن جاتے ہیں۔''

طبی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ غصے کی کئی ایک وجوہات ہیں مثلاً یہ جذبہ کچھ لوگوں میں موروثی طور پر زیادہ پایا جاتا ہے، کبھی کبھار گھر یا خاندان کا ماحول اسے پروان چڑھانے میں کردار ادا کرتا ہے یعنی جس گھر کے بچے اپنے بڑوں کو ہر مسئلے کے حل کے لیے غصے سے کام لیتا دیکھتے ہیں وہ پھر اسی رویے کو سیکھ لیتے ہیں۔ کچھ مخصوص علاقوں، ملکوں اور قوموں میں غصے کو بہادری کی پہچان سمجھا جاتا ہے خاص کر مردوں کو اس پر ابھارا جاتا ہے یا اسے ان کی مردانگی کی شان سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ نے

فرمایا: ''پہلوان وہ نہیں ہے جو کشتی لڑنے میں غالب آ جائے بلکہ اصلی پہلوان تو وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے آپ پر قابو پائے۔'' (بخاری ۶۱۱۴) ان کے علاوہ نیند کی کمی، بھوک و پیاس کی شدت، تھکاوٹ، بیماری اور کوئی پریشانی وغیرہ بھی غصے کے اہم اسباب ہیں۔

طبی تحقیق کے مطابق غصے کے آثار مختلف لوگوں میں مختلف ہو سکتے ہیں مثلاً چہرے کا رنگ بدل جانا جیسے محاورتاً کہتے ہیں کہ 'لال پیلے ہو جانا'، دل کی دھڑکن کا بڑھ جانا، سانس تیز چلنا، آواز کا اونچا ہونا، سر درد، پیٹ کا درد، پسینہ انا، جسم کا کپکپانا وغیرہ اور جذباتی آثار میں چیخنا چلانا، رونا اور تنہائی پسند ہونا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بقول محمد بشیر جمعہ 'افعال میں ترتیب نہیں رہتی، جسم تحلیل ہونے لگتا ہے اور انسان دیوانوں کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ اگر کوی غضب کی حالت میں اپنی بدصورتی کو دیکھے تو اپنے نفس سے نفرت کرے۔'' (شاہراہ زندگی پر کامیابی کا سفر، صفحہ ۱۳۱)

ماہرین کا کہنا ہے کہ غصے کے نقصانات کئی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ صحت برباد ہو جاتی ہے: ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ کسی بھی قسم کے اسٹریس یا غصے کی حالت میں انسانی جسم سے خاص قسم کے ہارمونز خارج ہوتے ہیں جنھیں Adrenaline کہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے جسم میں Responseدو طرح کا ہوتا ہے۔ Fightاور Flight یعنی انسان ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے یا تو مقابلہ (Fight) کرتا ہے یا جان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ نکلتا ہے (flight)۔ اب اگر انسان کسی ایسی مشکل میں پھنس جائے جہاں اس کی جان کو خطرہ ہے اور اس کے جسم سے یہ ہارمونز نکلیں اور ایسا کبھی کبھار ہو تو مضائقہ نہیں لیکن اگر یہ رویہ، ایک عادت اور روزمرہ کی روٹین بن جائے تو پھر انسان کو اس کے بڑے دوررس نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ یہ انسان کی صحت کو تباہ کر دینے والا رویہ ہے ایسے لوگ بہت سی بیماریوں مثلاً ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، ہارٹ اٹیک اور مختلف اقسام کے کینسرز میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۲۔ عمر کم ہو جاتی ہے: وہ لوگ جو عادتاً بہت غصہ کرتے ہیں وہ کبھی بھی لمبی عمر نہیں پاتے چاہے بیماری اس کی وجہ ہو یا لوگوں کے ساتھ ان کے برے تعلقات۔

۳۔ معاشی مسائل: ایسے لوگ کسی بھی ادارے کے ساتھ زیادہ عرصہ جم کر کام نہیں کر پاتے یا لوگ انھیں ملازمت دینے سے کتراتے ہیں اور اگر کہیں انھیں ملازمت مل بھی جائے تو اپنے جارحانہ رویے کی وجہ سے نکال دیے جاتے ہیں۔

۴۔ سماجی مسائل: عموماً لوگ غصیلے شخص کی صحبت پسند نہیں کرتے ہیں جو بات بے بات لڑنے جھگڑنے لگے اور اس طرح یہ شخص تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے جو اس کے مسئلے کو مزید بڑھا دیتا ہے اور اس میں مایوسی

پھیلانے کا سبب بنتا ہے۔

۵۔ مالی و جانی نقصان: اکثر اوقات ایسے لوگ حالت غضب میں خود کو اور دوسروں کو مالی و جانی نقصان بھی پہنچاتے ہیں اور جیل جانے کی نوبت آ پہنچتی ہے۔کئی مرتبہ گھروں کو اجاڑنے کی، طلاق کی اور اپنے پیاروں سے تمام عمر کے لیے قطع رحمی کی وجہ بھی حد سے بڑھا ہوا غصہ ہی ہوتا ہے۔اس طرح نہ صرف یہ کہ غصیلے لوگ اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہیں بلکہ اللہ کے گنہگار بن کر اپنی آخرت بھی برباد کر لیتے ہیں۔لہٰذا ہم سب کو اپنی زندگی کا ایسا لائحہ عمل بنانا چاہیے کہ ہم خود کو غصے کی تباہ کاریوں سے بچانے والے اور اس پر قابو پا لینے کے قابل ہوں اور اپنی دنیا و آخرت کو تباہ ہونے سے بچا لینے والے ہوں۔

آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ آج کے سائنسی دور میں قرآن وسنت اور ریسرچ سے ہمیں کیا مشورے ملتے ہیں جو غصے کو پی جانے اور اس پر قابو پا لینے میں ہمارے مددگار ہیں۔اس مد میں کی جانے والی تحقیقات میں ڈاکٹر اسپیل برجر کی ریسرچ بہت اہم ہے۔ڈاکٹر برجر ایک امریکی کلینیکل سائیکولوجسٹ ہیں۔وہ ماضی میں امریکن سائیکولوجیکل ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہ چکے ہیں اور غصے کے موضوع پر ایک اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں۔وہ غصے پر قابو پانے کے تین طریقے بتاتے ہیں:

۱۔Expression (غصے کا اظہار): وہ لکھتے ہیں کہ صرف اظہار Assertive Expression ہی صحت مندانہ اور مطلوب طریقہ ہے۔یعنی اپنی بات رپوائنٹ کو پورے اعتماد اور دعوے کے ساتھ اپنی اور دوسرے کی عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے دوسروں تک پہنچانا۔

۲۔Suppression (غصے کو دبا لینا) اور کسی دوسری طرف Redirect کرنا: ڈاکٹر برجر مشورہ دیتے ہیں کہ غصے کے وقت اپنے منفی ردعمل کو دبا لینا اور اپنی انرجی کو کسی مثبت کام میں لگا لینا غصے کا بہترین استعمال ہوسکتا ہے۔لیکن خیال رہے کہیں ہم اس رویے کو استعمال کرتے ہوئے اپنے سے طاقتور کے سامنے غصے کو دبا کر اپنے سے کمزوروں پر تو نہیں اتارتے؟

۳۔Calm رہنا (اندر اور باہر سے پرسکون رہنا) بقول ڈاکٹر برجر یہ سب سے مشکل لیکن صحت مندانہ رویہ ہے۔Calm رہنے کے لیے مختلف گر ہمیں مختلف تحقیقات سے ملتے ہیں اور زیادہ تر محققین اسی طرز عمل کو اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔حیرت انگیز طور پر قرآن و سنت سے ہمیں غصے پر قابو پانے کے جو بھی احکامات ملتے ہیں وہ تمام ہمیں پرسکون رکھنے والے ہی ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج جن اطوار کو سائنسی ریسرچ بہترین قرار دے رہی ہے وہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں چودہ سو سال پہلے اپنے نبی ﷺ کے ذریعے سکھا دیے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنے اسباق بھول گئے۔

آیئے ان احکامات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں اور

انھیں اپنی زندگیوں میں شامل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔اپنی سہولت کے لیے ان کو ہم دو بڑی اقسام میں بانٹتے ہیں (الف) فوری علاج/فرسٹ ایڈ اور (ب) مستقل علاج یا ریگولرٹریٹمنٹ۔

ا۔فوری کرنے کے کام (فرسٹ ایڈ):

☆ خاموش ہو جائیں: نبی ﷺ نے فرمایا ''تم میں سے جب کسی کو غصہ آئے تو خاموش ہو جائے۔'' (رواہ احمد:۲۱۳۶) اس حدیث میں بڑی حکمت ہے۔ شدید غصے میں اگر انسان صرف اپنی زبان پر قابو پالے تو سمجھ لے کہ اس نے آدھی جنگ جیت لی ہے۔ کیونکہ خاموش ہو جانے سے نہ صرف یہ کہ وہ خود پر کنٹرول کرنے، بدکلامی سے بچنے اور بہتر سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا ہے بلکہ اللہ کی ناراضگی سے بھی بچتا ہے۔ غیض وغضب کی حالت میں انسان وہ کلمات اپنی زبان سے نکال جاتا ہے جو اس کی دنیا وآخرت کو برباد کر دیتے ہیں کیونکہ اس کے منہ سے نکلا ہر حرف لکھا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''جو کوئی زبان سے بات نکالتا ہے اس کے پاس ایک نگران (لکھنے کو) تیار رہتا ہے۔'' (ق ۵۰:۱۸)۔ کئی ماہرین آج یہی مشورہ دیتے نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر لیلیٰ احمد اپنے مضمون Anger leads to danger میں غصے پر قابو پانے کے لیے فوری طور پر جو چار کام کرنے کا مشورہ دیتی ہیں ان میں سب سے پہلا یہی ہے کہ غصے میں سب سے پہلے خاموش ہو جانا چاہیے۔اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دس تک گنتی گننا شروع کر دیں یا گہرے سانس لیں۔ اسٹیفن کوی اپنی مشہور زمانہ کتاب ''پراثر افراد کی سات عادات'' میں اپنا "Pause button" دبانے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ انسان اپنے فوری ردعمل پر قابو پا کر ایک بہترین حل چننے کے قابل ہو سکے۔

☆ پانی کا استعمال: آپؐ نے فرمایا ''غضب شیطان سے ہے اور شیطان آگ کی مخلوق ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے۔ جب تم میں سے کوئی غضب میں آئے تو وضو کرے۔'' (سنن ابی داؤد)۔ اس کے علاوہ پانی پینا بھی مفید ہے۔آج ریسرچ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ غصے میں انسان کا باڈی ٹمپریچر نارمل سے بڑھ جاتا ہے لہٰذا ایسی حالت میں ہاتھ منہ اور پاؤں دھونا فائدہ مند ہوتا ہے۔

☆ پوزیشن بدلیں: آپ ﷺ کا فرمان ہے ''جب تم میں سے کوئی غصے میں ہو اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اگر غصہ جاتا رہے تو خیر ورنہ لیٹ جائے'' (ابی داؤد ۴۷۸۲)۔ ماہرین اس عمل کی بڑی افادیت بتاتے ہیں کہ انسان یا تو اپنی پوزیشن بدل لے یا اس جگہ سے ہٹ جائے۔

☆ ہلکی پھلکی ورزش کریں: سائیکولوجسٹ مشورہ دیتے ہیں کہ غصے کی حالت میں ہلکی پھلکی ورزش یا کسی بھی قسم کی جسمانی ایکٹوٹی بڑی مفید ہوتی ہے تاکہ جسم میں موجود انرجی کو بہتر کام میں لگایا جا سکے اور اس طرح اپنے نامکمل کاموں کو تکمیل تک پہنچانے میں مصروف ہو

جانا چاہیے۔اس سلسلے میں نماز پڑھنا بہترین عمل ہوسکتا ہے۔

☆کسی پرسکون جگہ کا تصور کرنا: اکثر ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ غیض وغضب کی حالت میں کسی پر سکون جگہ یا واقعہ کا تصور کرنا بھی انسان کو سکون دیتا ہے۔سوچنے کی بات ہے کہ اگر اس وقت ہم جنت کے بارے میں سوچیں تو کیسا رہے گا۔ اللہ کی کتاب میں مختلف انداز میں جنت کی بات کی گئی ہے مثلاً ''وہ ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، گھنے سرسبز وشاداب باغ اور بکثرت پھل، کھجوریں اور انار'' اور ''جنتی سبز قالینوں اور نفیس فرشوں پر تکیے لگا کر بیٹھے ہوں گے'' (سورۂ رحمٰن آیات ۶۴، ۶۸، ۷۶) اور یہ کہ جنتیوں کو کوئی خوف اور نہ کوئی غم ہوگا۔ (سورۂ الاعراف ۴۹)

☆کوئی پرسکون لفظ یا جملہ دہرانا: غصے کی حالت میں انسان شیطان کے قریب تر ہو جاتا ہے لہٰذا آپؐ نے ایسے وقت کثرت سے تعوذ پڑھنے کا حکم دیا ہے تاکہ انسان شیطان کے شکنجے سے نکل کر اللہ کی پناہ میں آجائے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔''اے نبی ﷺ نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔اگر کبھی شیطان تمھیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو'' (۷:۲۰۰)۔ ماہر نفسیات ڈاکٹر لیلیٰ احمد مشورہ دیتی ہیں کہ غیض وغضب کی حالت میں خود کو پر سکون کرنے والا کوئی لفظ یا جملہ دہرائیں مثلاً ''ریلیکس'' یا ''سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

ب۔ مستقل کرنے کے کام (ریگولر ٹریٹمنٹ):

یہ وہ کام ہیں جو آپ کو خود کو پرسکون رکھنے اور اپنی زندگی میں ٹھہراؤ لانے کے لیے روزانہ کرنے ہوں گے۔

ا۔ **اپنی زندگی کو منظم کریں**: اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا کرنے کے لیے آپ کو نظم وضبط کا پابند ہونا ہوگا اس سلسلے میں چند ٹپس حاضر خدمت ہیں:

وقت کا بہترین استعمال کریں: اپنے لمحات کی بھی حفاظت کریں تاکہ آپ کا وقت بیکار کاموں میں ضائع نہ ہو۔ اس سلسلے میں اگر ٹائم مینجمنٹ اسکلز سیکھنے کی ضرورت پڑے تو ضرور سیکھیں۔

اپنے دن بھر کے کاموں کی منصوبہ بندی کریں۔اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ سونے سے پہلے اگلے دن کے ضروری کاموں کی لسٹ بنالیں۔ صبح سویرے اور دن بھر میں جب ضرورت ہو اس لسٹ کو دہرائیں تاکہ آپ اپنے ٹارگٹ پر جمی رہیں۔

اہم کاموں کے اوقات مقرر کرلیں: آپ چاہیں تو کاموں کو نماز کے اوقات کے ساتھ باندھ سکتے ہیں۔

اہم چیزوں کی جگہیں مقرر کریں: مثلاً گھر کی یا گاڑی کی چابیاں، موبائل فون اور چارجرز، کتابیں، بچوں کے کپڑے، موزے، لنچ بکس وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں اگر وقت پر نہ ملیں تو کئی ضروری کاموں میں لیٹ ہونے اور غصے کا سبب بنتی ہیں۔اس کے علاوہ خود

کو اور دوسروں کو بھی ''استعمال کے بعد چیزوں کو واپس ان کی جگہ رکھنے'' کی عادت ڈالیں۔

اپنے کاموں کا آغاز صبح جلدی کریں: اگر آپ کی صبح کا آغاز تہجد کی نماز سے ہو تو کیا ہی کہنے لیکن کم از کم فجر ضرور سکون سے ادا کریں۔ صبح جلدی کام کے آغاز سے آپ اپنے ضروری کاموں کو وقت پر مکمل کرنے کے قابل ہوں گے اور اس طرح پریشان ہونے یا غصے میں آنے کی ایک بڑی جگہ سے بچ جائیں گے۔

۲۔ اپنی ذات میں ٹھہراؤ لانے کی کوشش کریں: اس سلسلے میں نماز اور قرآن مجید کی تلاوت بڑی فائدہ مند ہے۔ نماز اگر خشوع وخضوع سے ادا کی جائے تو رفتہ رفتہ انسان کی زندگی سے جلد بازی، بے چینی اور بے اطمینانی رخصت ہونے لگتی ہے۔ صبر کی عادت پڑنے لگتی ہے اور اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد مانگو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (البقرہ ۱۳۴) قرآن مجید کی بلاناغہ تلاوت بھی انسان کو بہت سے غموں، پریشانیوں اور خوف سے نجات دلاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور ہم نے قرآن نازل کیا جو تمام مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔'' (بنی اسرائیل ۸۲)

۳۔ **اپنی زندگی کو با مقصد بنائیں**: جن لوگوں کی زندگیوں میں بڑے مقاصد ہوتے ہیں وہ عام باتوں پر توجہ نہیں دیتے اور ان کی کامیابی کی یہی وجہ ہوتی ہے۔ بقول نپولین ہل ''ایک انتہائی اہم اور غور طلب بات یہ ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے جتنے بھی عظیم لیڈر گزرے ہیں، ان میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے لیڈر شپ کا یہ منصب اپنی تمام تر صلاحیتیں ایک قطعی اہم مقصد کے لیے وقف کر کے حاصل کیا۔ (دولت مند بننے کے آسان اور اچھوتے اصول، صفحہ ۳۱)۔ کچھ عرصہ پہلے گیلپ نامی ایک ادارے نے ۱۵۰۰ مرد و خواتین کے انٹرویو کیے جو ہر لحاظ سے کامیاب تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کا کہنا تھا کہ وقت ضائع کرنے والی سرگرمیاں جو کہ مقاصد کے حصول میں مدد نہ کریں آپ کی شدید ترین دشمن ہیں کیونکہ وہ آپ کو اپنے مقصد سے دور لے جائیں گی لہٰذا ایسی سرگرمیوں کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ اگر ہماری زندگی کا مقصد اللہ کے پسندیدہ بندوں میں شامل ہونا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا ہے تو ہم کو وہ کام کرنے ہوں گے جو اسے پسند ہیں اور انہی میں ایک کام غصے کو پی جانا بھی ہے۔

۴۔ **صحت مندانہ عادات اپنائیں**: اپنی زندگی کو بھرپور انداز میں جینے کے لیے آپ کو اپنی صحت کا خیال رکھنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق زندگی گزاریں اور بے آرامی، وزن کی زیادتی اور بیماری سے حتی الامکان بچیں۔

۵۔اپنی سوچ بدلیں: یہ بہت اہم ہے۔اپنی سوچ کو مثبت بنانے کے لیے ایسے جذبات اور نظریات کے بارے میں سوچنا بند کرنا ہوگا جو آپ کو غصہ دلاتے ہیں۔خود کو یقین دلائیں کہ ''انسان قیمتی ہے چیزیں نہیں'' لہٰذا چیزوں کے نقصان پر انسانوں کو اذیت دینے کا سبب نہ بنیں بلکہ ان سے درگزر کریں جیسا کہ فرمان الٰہی ہے ''اور غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں۔'' (الشوریٰ ۳۷) اپنے sub conscious mind کے ذریعے اپنی منفی سوچوں پر قابو پائیں اس سے پہلے کہ وہ غصے میں تبدیل ہوں یعنی دوسروں کو اور خود کو معاف کرنا اور درگزر کرنا سیکھیں۔ برائن ٹریسی اپنی کتاب ''جیسے خیالات ویسی زندگی'' میں رقمطراز ہیں کہ ''معاف نہ کرنے میں ایک بہت بڑا خطرہ یہ بھی ہے کہ آپ کی زندگی پر برے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ معاف نہ کرنے سے آپ کی زندگی کی نشوونما رک سکتی ہے۔معاف نہ کرنے سے بہت سی خواتین اور حضرات اپنی زندگیوں کو تباہ کر لیتے ہیں۔ ایسا صرف اس لیے ہوتا ہے کہ آپ کا غصہ بڑھتا جاتا ہے اور آپ کی ذہنی صلاحیتیں متاثر ہونے لگتی ہیں۔ جو کسی کو معاف نہیں کرتے وہ کبھی آزاد نہیں ہوتے'' (صفحہ ۴۵)۔یعنی ہمیں اپنی بہتری کے لیے دوسروں کی غلطیاں معاف کر دینی چاہئیں۔

آخر میں سب سے اہم بات۔

برائی کا جواب بھلائی سے دیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔'' (حم السجدہ ۳۴، ۳۵، ۳۶) یقیناً شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے لہٰذا اللہ کی پناہ میں آنے کے لیے کثرت سے تعوذ پڑھیں۔

معاف کر دینے کے سلسلے میں اکثر لوگوں کے دلوں میں ایک خلش رہتی ہے کہ بقول امام عبدالرحمٰن ابن جوزی ''اگر تو نے انتقام نہ لیا تو اس سے تیری عاجزی اور کمینگی اور ذلت اور حقارت نفس ظاہر ہو جائے گی اور تو لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہو جائے گا۔'' اس احساس کے جواب میں مزید لکھتے ہیں کہ ''اپنے نفس سے کہے آج تو اتنی بات برداشت کرنے کو ناپسند کرتا ہے اور قیامت کی رسوائی اور ذلت ناپسند نہیں کرتا جبکہ اللہ تعالیٰ تیرا ہاتھ پکڑے گا اور تجھ سے انتقام لے گا، تو لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہونے سے ڈرتا ہے اور اس بات سے نہیں ڈرتا کہ قیامت کے دن تو اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور نبیوں کے سامنے ذلیل ہوگا'' (صفحہ ۲۸۵)

اس سلسلے میں ایک حدیث بہت اچھی طرح ہماری رہنمائی کرتی ہے۔آپؐ نے فرمایا: ''میں اس شخص کے لیے جنت کے اطراف میں ایک گھر کا ضامن ہوں

جس نے حق پر ہوتے ہوئے بھی جھگڑا چھوڑ دیا۔'' (ابی داؤد ۴۸۰۰)

اگر ہم ان تمام باتوں پر عمل کریں گے تو ان شاء اللہ ضرور ان لوگوں میں شامل ہوں گے جو ''اپنے غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے۔'' (۱۳۴:۳)

میری ماں

جب اداسی در و دیوار پہ چھا جاتی ہے
دل کے تاروں میں کہیں سات سروں کی مالا
ایک خاموش چھناکے سے بکھر جاتی ہے
جب میں حالات کے بخشے ہوئے مایوس اندھیروں میں کہیں دور
بھٹک جاتی ہوں
ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دینے لگتا
دل کسی زرد ستارے کا سوالی بن کر
گھپ اندھیرے میں کسی راہ کی ناکام طلب کرتا ہے
تب کہیں صفت چاند نکل آتا ہے
شاخِ جاں پر نئی امید کی کلیاں سی مہک اٹھتی ہیں
سانس خوشبو سے لدی جاتی ہے
مجھ پہ چلتا نہیں پھر گھور اندھیروں کا طلسم
کہ مجھے اس کی الوہی کرنیں
خود میں محصور کیے رہتی ہیں
چاند کا نور، کہ مضراب کی مانند مری ذات کے سُر
مجھ کو لوٹاتا ہے ایک پیار بھری لَے کے ساتھ
میں بھی ہنستی ہوئی دنیا میں پلٹ آتی ہوں
ان پلٹتے ہوئے لمحات کا اعزاز مرے چاند تجھے حاصل ہے
تیری دن رات کی گردش ہے مری ذات کے گرد
اور اک تیری کشش سے مرے دل دریا میں
ہر دم اک مدّ و جزر رہتا ہے
تجھ کو دیتا ہے تری ذات کا ایقان اگر میرا وجود
میں تجھ سے تری کرنیں لے کر
اپنے قدموں کو جماتی ہوں
ہاں تجھے ربِ ازل
تا ابد ایوں ہی مرے سر پہ چمکتا رکھے
میری ماں
عمر رواں کا احساں!

غزل

باتوں باتوں میں دہرائی جاسکتی ہے
پَل پَل بچوں کو سمجھائی جاسکتی ہے

نیت کا بھی اجر، عمل جیسا ہوتا ہے
نیکی ہر صورت سے کمائی جاسکتی ہے

مل جل کر نفرت کی جھیل کو صاف کریں ہم
دل میں جمی مُدّت کی کائی جاسکتی ہے

سچ تو یہی ہے جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے ہیں
بات یہ سچی سب کو بتائی جاسکتی ہے

اس کو خیالِ خام سمجھ کر دل سے نکالا
بات زبردستی منوائی جاسکتی ہے

ہم نے غزل میں اس کا سراپا لکھ ڈالا ہے
دل میں جو تصویر لگائی جاسکتی ہے

بامِ فلک پر جن کی قسمت لکھی گئی ہو
اُن ذہنوں سے کب دانائی جا سکتی ہے

(سید انور جاوید ہاشمی)

نویدِ صبح

مرغزار شوق میں اب آئے گی وہ صبح عید
لائی ہے بادِ صبا صبح بہاراں کی نوید

شہر جاناں کا مسافر رات بھر تڑپا کیا
دل کو شاداں کر گئی پھر صبح دم منزل کی دید

دامنِ افلاک پر لرزاں ستاروں کی چمک
کہہ رہی ہے صبح تازہ کی ہے یہ روشن امید

چل پڑیں گر دل میں لے کر ولولۂ جذب وشوق
راستہ خود ہی بنا دیتی ہے وہ ذاتِ حمید

جیسے بھی حالات ہوں جتنا کٹھن ہو راستہ
دل یہ کہتا ہے کہ آخر آئے گا روز سعید

(ذکیہ فرحت)

☆☆☆

غزل

ستم پر ستم ہم سہے جائیں گے
مگر بات دل کی کہے جائیں گے

مخالف ہی دھاروں کے جائیں گے ہم
جو بہتے رہے ہیں بہے جائیں گے

کسی دن تو اپنا بھی وقت آئے گا
ابھی وقت کی ہم سہے جائیں گے

جنہیں بے وفا تم سمجھتے ہو آج
وفادار کل وہ کہے جائیں گے

زباں پر کبھی قفل لگ جائے گا
مگر اپنے آنسو بہے جائیں گے

زمانہ سنے مت سنے اے شہودؔ
کہانی ہم اپنی کہے جائیں گے

(شہود ہاشمی۔ریاض)

ڈاکٹر پروین سیف مانسہروی

آج کا پاکستان

(معذرت کے ساتھ)

آؤ لوگو سیر کرائیں تم کو پاکستان کی
جس کی خاطر ہم نے دی قربانی لاکھوں جان کی
پاکستان زندہ باد پاکستان زندہ باد

یہ دیکھو اسکول میں بیٹھا قوم کا جو معمار ہے
فلم میں ہیرو نمبر ون اور علم میں سب بیکار ہے
کھائیں اپنے دیس کا اور تقلید کریں جاپان کی
اس کی خاطر ہم نے دی قربانی لاکھوں جان کی

دیکھو کام مسیحاؤں کے سب کی کھال اتاریں یہ
میت سے بھی فیس بٹوریں موت سے پہلے ماریں یہ
کشتی بیچ بھنور کے ڈوبے مجھ جیسی انجان کی
ایسی ہے یہ اندھی نگری جس کا چوپٹ راج ہے
اس کی پانچوں گھی میں ہوں گی جس کے سر پر تاج ہے
دونوں ہاتھوں مال کمائیں کیا پروا ایمان کی

محنت کش کے گھر ہے فاقہ، خالی ہاتھ کسان ہے
روکھی سوکھی کو بھی ترسیں کب قسمت میں نان ہے
خان، وڈیرے کا کتا بھی بوٹی کھائے ران کی
یہ دیکھو یہ کالی بھیڑیں پھیلا ان کا جال ہے
ہاتھ بھی لمبے پاؤں بھی لمبے موٹی ان کی کھال ہے
ان کی پیٹھ پہ حاکم دستہ دولت یہ شاہان کی

اس جانب بھی دیکھو لوگو، پاک وطن کے لیڈر ہیں
اوپر شیر کی کھال کو اوڑھے اندر سے سب گیدڑ ہیں
سچی بات تو ہو گی کڑوی بات ہے پر ایمان کی
زرداروں کے جال میں پھنس کر ہم سب ہی پچھتاتے ہیں
زہر ملی ہر شے ہے، اب تو سونگھ سونگھ کر کھاتے ہیں
پرویں ان کا کیا ہے بھروسہ، شاگردی شیطان کی

اس کی خاطر ہم نے دی قربانی لاکھوں جان کی

شاھدہ ناز قاضی

مصلوبِ وفا

شبانہ کا فون بڑی مشکل سے ملا تھا۔ وہ کتنے دنوں سے مسلسل اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی، ہر بار اس کا فون بند مل رہا تھا۔ لیکن آج اس کا فون آن تھا.....اور رنگ ٹون بجتے ہی شبانہ نے فون اٹھالیا تھا۔

یہ وہی تھی اس کی عزیز از جان سہیلی۔ جس کے ساتھ ایک یا دو دن ایک دو ماہ، ایک یا دو سال کی دوستی نہیں، بلکہ بیس سال پرانی دوستی تھی۔ بیس سال۔ سارے لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے سے جیسے ایک پل میں گزر گئے۔

بیس سال کے کتنے گھنٹے، کتنے منٹ، کتنے سیکنڈ گزرے تھے، کتنے سورج نکلے اور کتنے چاند ڈوبے تھے۔ کتنی عیدیں اکٹھی منائی تھیں۔ اس گہری دوستی کی یادیں اس کے چہار سو اس طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے کسی نے آنگن میں پھولوں کا بھرا ٹوکرا الٹ دیا ہو۔ اور ہر کونا مہک رہا ہو..... ہاں یہ دوستی حسن سلوک..... محبت خلوص کی اپنی مثال آپ تھی۔

زندگی میں ایسے بہت کم لوگ ملتے ہیں جو اتنے اچھے لگتے ہیں کہ جن کے ساتھ آپ اپنے آپ کو بے تکلف اور پرسکون محسوس کرتے ہیں۔ جن سے آپ کو اپنا آپ چھپانا نہیں پڑتا..... جو ہے، جیسا ہے، جہاں ہے بس ایک دوسرے کو accept کرتے چلے جانا ہی شاید دوستی کی مثال ہے۔ کتنے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آپ تکلفاً گفتگو کرتے ہیں اور بس۔ کتنے ایسے ملنے والے ہوتے ہیں جن کی آمد سے آپ کو ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں مبادا کوئی کمی، کوئی غلطی، کوئی پہلو ایسا تشنہ نہ رہ جائے ورنہ خاندان میں یا ملنے جلنے والوں میں ایک بہت بڑا ایشو بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ کتنے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو آپ کے حالات کی خبریں سونگھنے آتے ہیں تاکہ دوسروں کو سنا سکیں لیکن ان ملنے جلنے والوں، ان پیارے رشتہ دار اور احباب میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو آپ سے محبت، پیار اور خلوص کی گرمی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ جن کی آمد بہار کا جھونکا ہوتی ہے۔ آپ ان کی آمد کے خیال سے ہی اڑے اڑے پھرتے ہیں..... پاؤں میں لپٹنے لگ جاتے ہیں دل چاہتا ہے اپنا کلیجہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ ان کے وہ قدم جو آپ کے گھر تک انہیں لے کر آتے ہیں آپ ان قدموں کے بھی شکر گزار ہوتے ہیں۔

اور شاید اس نفسا نفسی کے دور میں یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ نئی نئی شادی کے بعد کراچی گئی تو

وہاں اسے بالکل بہنوں کی طرح محبت کرنے والی شبانہ (شبو) اپنی ہمسائیگی میں مل گئی تھی۔

وہ پہلے دن ہی ان سے ملنے ان کے گھر چلی آئی تھی۔ اپنا تعارف کروایا۔ اس کا میاں واپڈا میں ملازم تھا۔ وہ دو پیارے پیارے بچوں کی ماں تھی۔ دونوں بیٹے بتدریج دو سال اور چھوٹا صرف چند ماہ کا تھا۔ اس کے رویے میں سادگی اور خلوص کی گرمی تھی۔ اس شام کو اس کے گھر سے کھانے کی ٹرے آ گئی۔

''ارے آپ نے تکلف کیوں کیا؟ میں کھانا بس پکانے ہی والی تھی۔ چیزیں set کرتے کرتے کچھ دیر ہوگئی ورنہ..... پکا لیتی یا احسن سے منگوا لیتی.....''

''میں تمہاری ہمسائی ہوں، سنا تم نے، جو میرا فرض ہے وہ میں ادا کر رہی ہوں۔ میں بتا نہیں سکتی کہ تمہارے آنے سے میں کتنی خوش ہوں..... یہ گھر کئی ماہ سے خالی پڑا تھا۔ جب اسے آباد دیکھا تو مجھے کس قدر سکون ملا ہے۔''

آہستہ آہستہ۔ بالکل آہستہ آہستہ پہلے تو شرمین نے شبانہ کو باجی کہہ کر پکارا، پھر دن بدن بڑھتی دوستی ملنے ملانے نے یہ باجی کی پخ اتار پھینکی۔

ایک روز شبانہ نے خود کہا ''یہ کیا تم مجھے باجی باجی کہتی رہتی ہو؟ میں تمہاری فرینڈ ہوں، دوست ہوں، سمجھیں۔ عمروں کا فرق چند سال کا بھی ہو تو کوئی اتنا نہیں ہوتا۔ تم باجی کہتی ہو تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے..... میں تو تمہیں سہیلی سمجھتی ہوں۔ جیسی بچپن میں ہوتی ہیں..... پرخلوص، بے ریا، بے غرض۔'' اور پھر یہ دوستی کا بندھن جو ایک کچے دھاگے سے شروع ہوا تھا اس میں روز ایک نئے تار کا اضافہ ہوتا چلا گیا..... اور بندھن مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا..... اپنے دکھ اپنے سکھ وہ شبانہ سے شیئر کرنے لگی۔ وہ بیک وقت ماں، بہن، سہیلی اور راز دار بنتی چلی گئی۔

شبانہ بھی اپنے پرابلم، اپنے شوہر اور سسرال کے دیئے ہوئے زخموں پر مرہم اسی سے لگواتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن گئی تھیں۔ ایک دوسرے کی ڈھارس اور حوصلہ۔

جب کبھی اس کی خانگی زندگی میں کوئی جھگڑا ہوتا تو شبانہ اپنے شوہر کی بدزبانی کی شکایت لے کر اس کے گھر بھاگی آتی..... '' احسن بھائی آپ ہی کچھ کیجیے۔ سمجھا لیجیے اپنے بھائی کو چھوٹی چھوٹی سی بات پر بگڑ کر چلانے لگتے ہیں۔ کبھی چیزیں اٹھا کر پھینکنے لگتے ہیں۔ بچے الگ ڈرے ڈرے سہمے سہمے رہتے ہیں..... میں اپنی ماں کو اپنا غم نہیں سنا سکتی۔ وہ پہلے ہی دل کی مریضہ ہیں۔ بھائی بڑے غصے والے ہیں۔ بتایا تو کہیں مار ہی نا لگا جائیں۔ یہ فرید (شبانہ کا شوہر) میرے بھائیوں سے بھی بہت بدتمیزی سے بات کرتا ہے۔'' وہ شکایت کرتی تو شرمین اسے دلاسا دیتی اس کے آنسو پونچھتی۔

''آپ فکر نہ کریں بھابھی..... میں اسے سمجھا دوں گا۔ غصہ تو ویسے بھی حرام ہے..... چھوٹی غلطیاں معاف کرنے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ ان کو ایشو بنا کر

گھر کا ماحول تو کبھی بھی خراب نہیں کرنا چاہیے۔''

تب اس مشکل گھڑی میں شرمین اور احسن بڑے سلیقے قرینے سے فرید کو اس طرح سمجھاتے کہ بیوی پر بھی حرف نہ آتا اور بات بھی اس کے کانوں تک پہنچ جاتی اور دونوں جا کر ان کی صلح صفائی کروا دیتے۔ جس کے بعد گھر میں گپ شپ کا نارمل ماحول پلٹ آتا۔ اکٹھے چائے پینے کے بعد خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ آتے۔ اسی طرح احسن ایک بار چھوٹی سی بات پہ بگڑ کر گھر چھوڑ کر اپنے دوست کے گھر چلے گئے۔ تب شرمین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ وہ بھی مورل سپورٹ کے لئے فرید بھائی کے گھر گئی۔ شبانہ اور اس کا میاں فرید ٹیکسی کروا کر احسن کے دوست کے گھر پہنچے۔ خوب بحث ہوگئی..... بالآخر وہی ٹیکسی ان چاروں کو اپنے گھر تک چھوڑ گئی۔ یوں ہنستے مسکراتے پل پھر سے لوٹ آیا کرتے۔ کتنی بہاریں ان دونوں کے سامنے آئی تھیں۔ کتنی خزائیں ان کے دروازے پر دستک دے کر چلی گئی تھیں۔ بچوں کے سارے مراحل ان دونوں کے سامنے گزرے تھے۔ حتیٰ کہ شرمین کے گھر پہلا بیٹا سیف الاسلام ہونے والا تھا تو وہ بہت بے چین ہوگئی تھی۔ اس کی متلی ہی نہیں رک رہی تھی۔ شبانہ اس لمحے اس کی مدد کو موجود تھی۔ وہ آتے ہی گھر کو سنبھال لیتی۔ بیسن میں آ کر کچھ برتن پڑے ہوتے وہ دھو دیتی، اسے قہوہ بنا کر لا دیتی۔ اس سے مزے مزے کی باتیں کرتی۔ شرمین کا دل بہل جاتا۔ مزے مزے کی گپ شپ، ادھر ادھر کی باتیں۔ ٹی وی پر چلنے والے پروگراموں پہ تبصرہ، اخبارات کے کالم، فلمی ہیرو، ہیروئن کے نئے اسکینڈل، دو گھنٹے بعد جب چاق و چوبند ہو جاتی تو وہ اپنے گھر جاتی۔

شرمین کی بہن نہیں تھی۔ امی بڑے بھائیوں کے ساتھ لاہور میں تھیں۔ اسے مشوروں اور نگہداشت کی ضرورت تھی۔ وہ فون پہ اگرچہ اپنی والدہ اور ساس ماں سے مسلسل رابطے میں تھی اور ان کے زریں مشوروں پر عمل بھی کر رہی تھی لیکن وہ شبانہ جو سب سے قریب تھی، جو اس کے منہ سے نکلنے والی ایک آہ سے بھی واقف تھی وہ شرمین کے لئے بڑا سہارا ثابت ہو رہی تھی۔ اپنے گھر سے کھٹی چاٹ، دہی بھلے بنا کر لے آتی۔ ''مجھے پتا تھا تمہارا یہ کھانے کو دل کر رہا ہوگا۔''

''آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے سب کچھ؟ بائی گاڈ میں یہی سوچ رہی تھی.....اُف۔''

''ابھی ایک اور چیز بھی لو..... یہ دیکھو املی کی چٹنی۔ جناب چاٹ پر ڈالو اور کھاؤ..... کیا یاد کرو گی.....کیسی دوست تھی۔''

''تھی نہیں..... ہو..... زندگی بھر اللہ تعالیٰ یونہی محبتیں قائم رکھے۔''

زچگی کے دنوں میں اگرچہ اس کی امی اور ساس ماں آ گئی تھیں، لیکن وہ گھر میں یخنی بنا کر ہسپتال بھی بھجواتی رہی۔ امی کو واپس لوٹنا پڑا بھابھی کی بھی ڈلیوری متوقع تھی۔ ساس ماں جی کی اپنی طبیعت بھی کچھ خراب

تھی۔شوگر لیول نارمل نہیں تھا۔ پھر انہیں دمے کی بھی تکلیف تھی جو کراچی آ کر کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ پھر ان لمحات میں شبانہ اس کے ساتھ ایک سائے کی صورت تھی۔

بچہ بعض اوقات ساری رات روتا۔ جاگ جاگ کر اس کی آنکھیں متورم ہو جاتیں۔ وہ دس بجے کے قریب معمول کے مطابق خیر خبر لینے آتی تو گھبرائی ہوئی شرمین بچے کو لے کر سلانے کے لئے ٹہل رہی ہوتی۔ اڑی ہوئی رنگت رت جگوں سے متورم آنکھیں بچے کے اس طرح رونے سے حواس باختہ۔

شبانہ بچہ اس کی گود سے لے لیتی۔ بچے کو سینے سے لگائے تھپکتی۔اس کا مسئلہ وہ جلد سمجھ کر حل کر دیتی۔ بچہ بھی چپ چاپ سکون سے سو جاتا اور وہ شرمین کو سونے کا کہہ کر چلی جاتی۔جیسے رحمت کا جھونکا ہو۔

اوپر نیچے دو بچے اللہ پاک نے شرمین کو اور عطا کر دیئے۔ اب وہ دو بیٹوں اور ایک پیاری سی بیٹی کی ماں تھی۔

وقت کیسے چپ چاپ گزرتا چلا جا رہا تھا۔ دونوں مل کر بچوں کی شاپنگ کرتیں، کبھی نٹنگ پر نمونے سیکھے جاتے۔ بچوں کے سویٹر بنے جاتے۔ ہاتھوں میں اون سلائیاں لیے وہ دنیا بھر کی باتیں کرتیں اور ہنستی رہتیں۔ گھر کی خریداری ایک دوسرے سے ڈسکس ہوتی۔ پرنٹ اور قیمت کا موازنہ ہوتا۔

انہوں نے بچے سکول داخل کروائے تو ایک ہی سکول میں۔ شبانہ کا شرمین کی زندگی میں کتنا عمل دخل تھا۔شام کو احسن گھر لوٹتا تب بھی شبانہ کھڑے کھڑے آ جاتی..... ہاتھ میں مزے کی کوئی نہ کوئی پلیٹ لیے۔

''نہیں جناب یہ اپنے بھائی کے لئے لائی ہوں، چائے کے ساتھ پکوڑے چکن اور اسپیگٹی کے۔

''اوہ..... واؤ، کیا خوشبو ہے۔'' کبھی تلی ہوئی مچھلی، سینڈوچ..... کبھی کوفتے..... شامی کباب..... شبانہ کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔شرمین اس کے سگھڑاپے سے بہت متاثر تھی۔کیسی بجلی بھری تھی اس کی شخصیت میں۔گھر کے کام ماسی سے کروالیتی۔کھانا بھی بنالیتی۔ گھنٹہ بھر میں شرمین سے گپ شپ بھی لگا جاتی.....شام کی چائے پہ روز کوئی نہ کوئی مزے کی ڈش چائے کے ساتھ کھاتے ہوئے احسن عش عش کر اٹھتا..... وہ بھی دل میں شبانہ کے حسن خلوص سے مرعوب ہونے لگتی۔

احسن کبھی بے اختیار ہی شبانہ کے سامنے کہہ دیتا'' بھابھی آپ اسے اپنا شاگرد بنالیں تاکہ مجھے نت نئے کھانے تو ملیں۔شرمین تم اپنی سہیلی سے کچھ سیکھتی کیوں نہیں ہو۔سارا دن گپ شپ لگا سکتی ہو۔تو یہ کیوں نہیں کہ کچھ عقل کی بات بھی سیکھ لی جائے۔''

شرمین صرف سر ہلا کر رہ جاتی۔احسن کہہ تو ٹھیک رہا ہے۔ نت نئی ریسپی پوچھی اور سیکھی جا سکتی ہے۔ پتا نہیں بچوں کی مصروفیت میں وہ اس سگھڑاپے کو اپنا ہی نہیں سکی۔ روزانہ نت نئی چیزیں بنانے کا حوصلہ اور وقت اس کے پاس نہیں تھا۔ شبانہ کے پاس کام والی

ماسی تھی۔ جبکہ سارے برتن کپڑے تک اسے خود ہی دھونا ہوتے تھے۔ اس کے شوہر کی تنخواہ فی الحال اتنی نہیں تھی کہ ماسی افورڈ کر سکتے۔ ابھی تنخواہ کا کافی حصہ کرائے کی مد میں اٹھ جاتا تھا۔ بچوں کے پمپرز کا خرچہ اور دودھ کا بل ہی ہوش اڑائے دے رہا تھا۔

گزرتا وقت بہت سی تبدیلیاں خاموشی سے لاتا چلا گیا۔ وہ ننھے بچے جنہوں نے فلیٹ میں آنکھ کھولی تھی اب سکول جانے لگے تھے اور ہر سال وہ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے (شبانہ کے بچے کالج کے سٹوڈنٹ بن چکے تھے) پڑھائیاں امتحان، ٹیسٹ، ہوم ورک، سب مصروفیات اسے گھیرے رہتیں۔ کتنے انقلاب آ گئے تھے۔ اچانک اس کی والدہ انتقال کر گئی تھیں۔ والد تو شرمین کی شادی کے فوراً بعد ہی ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ میکہ جو ماں کی دم سے آباد تھا اب ختم ہو گیا تھا۔

اداسی، ڈپریشن۔ ایک عجیب سا احساس یتیمی اپنے پچھلوں کو کھو دینے کا احساس شرمین کے اعصاب کو تھکائے دے رہا تھا۔ شبانہ کے والدین کراچی میں ہی موجود تھے۔ والدین حیات ہوں تو ساری بہاریں ان کے ساتھ پھول برساتی ہیں۔ شبانہ اپنے والدین، بہن بھائیوں کی چاہتوں اور لاڈ کے قصے سناتی تو شرمین ایک ہوک کو سینے میں دبا لیتی اور سچے دل سے دعا مانگتی۔ اے اللہ پاک، شبانہ کے والدین کو لمبی عمر دینا۔ کبھی کبھی شبانہ کے والدین سے اسے وہی انسیت محسوس ہوتی جو اپنے والدین سے تھی۔ شاید ممتا کی خوشبو اور باپ کی شفقت کی مہک ہر جگہ، ہر مقام، ہر گوشے میں ایک ہی طرح سے ہوتی ہے۔ اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔

اچانک ہی بس اچانک ہی ایک بہت بڑی تبدیلی آ گئی۔ یہ بدلاؤ زندگیوں میں کچھ نیا پن اور نئے الجھاؤ کے ساتھ آ گیا۔ شبانہ کے شوہر کو دبئی میں نوکری مل گئی اور وہ چلا گیا۔ ایک دو سالوں میں ہی شبانہ کے گھر کا رہن سہن، طور طریقے بدلتے چلے گئے۔ روپے پیسے کی ریل پیل نے زندگی کا پہیہ ایک دم کسی اور ہی رخ گھما دیا۔ شبانہ کے گھر کا فرنیچر بدلا..... پردے بدلے..... اس کے بالوں کا رنگ بدلا..... پھر نئی کرولا..... گھر کے دروازے پر آ کر کھڑی ہوئی تو لوگ رشک سے دیکھتے ہی رہ گئے۔ شرمین کو شبانہ کی ہر نئی چیز، نئی گاڑی، نئے انداز سے محبت تھی۔ وہ اس کی خوشی میں ایسے خوش ہوتی جیسے یہ اس کی اپنی ہو اور کبھی بھولے سے بھی اس کے دل میں موازنے یا اونچ نیچ کا خیال نہیں آیا۔ بھلا وہ کیوں حسد کرتی۔ اپنی سب سے پیاری دوست سے جو بہنوں کی طرح تھی۔ کوئی اپنوں سے بھی جلتا ہے اور پھر رزق تو اللہ کی دین ہے۔ جس کو چاہے زیادہ دے جس کو چاہے تھوڑا۔ شرمین اپنے حال میں اپنی زندگی میں بہت قانع اور بہت خوش تھی۔ محبت کرنے والا شوہر، پیارے سے بچے، چھوٹا سا کنبہ، خوبصورت، مگر سادہ سا گھر۔

وہ جب چاہتے دریاں اٹھا کر سمندر کے کنارے پکنک منانے چلے جاتے..... ہنستے کھیلتے۔ دنیا کی رونقیں اور سمندر کی بے تابیاں دیکھتے۔ کوئی خاندانی جھگڑا نہیں۔ چخ چخ نہیں.....

لیکن کہیں پہ دوستی کے پرخلوص رشتوں میں بدلاؤ آتا جا رہا تھا۔ شبانہ کا رویہ دن بدن.....ایک سہیلی سے زیادہ ایک شیخی خور عورت کا سا ہوتا جا رہا تھا..... وہ بار بار اپنے گھر کا شرمین کے گھر سے موازنہ کر کے اس کے منہ پر جتانے لگی تھی۔ پہلے اس کے لہجے میں یہ رعونت اور کروفر نہیں تھا..... نہ ہی وہ بات بات پر طنز کے تیر چھوڑتی تھی.....لیکن.....دولت کیا انسان کو اتنا تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ باتوں باتوں میں اسے اس کی کم مائیگی کا احساس دلاتی۔

''افوہ تمہیں کب عقل آئے گی کیسی گھٹیا کوالٹی کی بیڈشیٹ ڈالی ہوئی ہے۔ کمرے کا سارا حسن غارت ہو گیا ہے۔ میں چین ون سے ایسی بیڈشیٹز لے کر آئی ہوں تم دیکھو گی تو آنکھیں پھٹ جائیں گی۔''

''اللہ مبارک رکھے.....جو بھی تم لائی ہو۔''

''دماغ ہونا چاہیے، خریداری کے لئے.....میری چوائس تو شروع سے ہی بہت اچھی تھی۔ اب تو گھر والے بھی مان گئے ہیں، بھابھیاں اپنی شاپنگ بھی مجھ سے کرواتی ہیں۔''

''واہ''

''تم نے میرے مشوروں سے فائدہ اٹھایا ہوتا تو میں تمہارے گھر کا حلیہ ہی تبدیل کر دیتی۔''

شبانہ کے ہونٹوں پر بات آ کر رک گئی کہ پلے پیسہ ہو تو اچھے اچھوں کو عقل آ جاتی ہے..... چند سو اور چند ہزار کی چیز میں لامحالہ، فرق تو ہو گا۔ لیکن وہ اپنے شوہر کی حیثیت اور اس کے مالی معاملات میں کسی دوسرے کی مداخلت کیوں کروائے؟ کیوں اپنی سبکی کروائے؟ اللہ تعالیٰ نے جانے کتنوں سے اچھا رکھا ہے۔ اسی کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ شبانہ کے گھر میں نئے فرنیچر، نئے پردوں کی اٹھان، چمک دمک کے سامنے شرمین کا گھر ویسا ہی پرانا پرانا.....میلا میلا لگنے لگا تھا۔

شبانہ کے لب و لہجے میں کچھ عجیب سا انداز در آیا تھا۔

''اوہ شرمین! تمہیں اب تک عقل نہیں آئی۔ دنیا دیکھو کہاں سے کہاں چلی گئی ہے اب تک تم نے وہی دقیانوسی صوفے رکھے ہوئے ہیں۔ ان کو ذرا بدلو، کم از کم ان کا کپڑا ہی بدل دو۔ نئے کشن رکھو، ذرا نئی سینٹر ٹیبل ہی لے آؤ۔ گھر کو نئی لک دو۔'' وہ بول رہی تھی اور شرمین سوچ رہی تھی کیا اسے یہ سب باتیں خود نہیں معلوم کہ وہ سفید پوشی کا بھرم کیسے قائم رکھے ہوئے ہے؟ شبانہ بات کرتی چلی جاتی اور شرمین کے سینے میں دھواں سا بھرنے لگتا.....

وہ جب اس کے گھر آتی وہ ہر دوسری بات میں اسے کسی نہ کسی بات پر شرمندہ ضرور کرتی.....''تم نکمی ہو، تم نالائق کی نالائق۔ تمہیں ذرا عقل نہیں گھر کو سلیقے

سے کیسے رکھتے ہیں، مجھے تو اب تمہارے گھر آتے ہوئے گھبراہٹ ہوتی ہے۔'' شرمین چپ کی چپ رہ جاتی۔کبھی اپنی چیزوں کی شوآف کرتے ہوئے بتاتی۔'' یہ دیکھو..... میں نے کیسی شاپنگ کی ہے..... تین ہزار میٹر تو نئے صوفے کا کپڑا ہے۔ تبھی تو ڈھلکیں مارتا ہے۔ میں سستی چیزیں پسند ہی نہیں کرتی۔ ہر بندے کا ایک معیار ہوتا ہے میرا معیار بہت ہائی ہے۔ یہ دیکھو کرسٹل کا واز..... میں پانچ ہزار کا لے کر آئی ہوں۔تمہیں دکھانے کے لئے لائی ہوں۔کیسا ہے؟''

''اچھا ہے، بہت اچھا ہے۔'' شرمین کا حلق اس کی قیمت سن کر خشک ہونے لگتا۔تنخواہ دار حق حلال کی کھانے والا یہ کبھی افورڈ نہیں کرسکتا۔شرمین کو ایسے لگنے لگا تھا جیسے وہ اس کی غریبی، سفید پوشی کا مذاق اڑا رہی ہے۔

''تمہیں ذرا ہوش نہیں۔ اپنے کپڑے دیکھے ہیں۔ ڈھنگ کا لباس تمہارے پاس نہیں..... نہ اچھی کراکری تم نے خریدی ہے۔تم سمجھدار ہوتیں تو تھوڑا تھوڑا بچا کر گھر کی حالت بدل لیتیں۔کبھی اچھا سا سوٹ ہی لے لیتیں..... آج کل تو قسطوں میں اتنی اچھی اچھی ماڈرن چیزیں مل جاتی ہیں۔'' یہ تبصرہ، یہ نصیحت، یہ طنزیہ جملے..... سن سن کر شرمین جیسے بجھ کر رہ گئی تھی۔

پتا نہیں شرمین چڑچڑی کیوں ہوتی جارہی تھی۔ فاصلے ان سہیلیوں کے درمیان آکر چپکے سے ٹھہر گئے تھے۔ دولت کی دیوار ان کی دوستی کے درمیان کھڑی ہوگئی تھی۔ شبانہ کے اطوار بدل گئے تھے..... بالوں کو بلانڈ کروالیا تھا، مہنگے سے مہنگے بوتیک کے کپڑے پہنے وہ واقعی شہزادی لگتی۔اب دو جوان بچوں کی ماں تو کسی طور پر نہیں لگتی تھی۔ جم جوائن کرنے سے وہ مزید دبلی پتلی ہوگئی تھی۔

شرمین اس روز پہلی بار اپنے شوہر سے ناراض ہوئی۔ ناراض کہنا جچا نہیں بلکہ ان کی آپس میں باقاعدہ جھڑپ ہوئی۔ وہ گلہ کررہی تھی کہ آپ نے مجھے کبھی اتنے پیسے نہیں دیئے کہ میں کچھ رقم بچا کر گھر کی کچھ Renovation کرلوں۔ یا چلو اچھا سا مہنگا سا اپنا سوٹ ہی لے آؤں اور بچوں کے لئے عالی شان جوتے اور کپڑے خرید لاؤں۔

''جس طرح میں گھٹ گھٹ کر جی رہی ہوں۔ میرا ہی حوصلہ ہے۔ بچے بڑے ہوتے یا انہیں کوئی سنبھالنے والا ہوتا تو میں کہیں کسی کمپنی میں جاب کرلیتی۔''

شوہر بھی شاید اس کی روز روز کی چخ چخ سے تنگ آچکا تھا۔بھڑک کر بولا۔

''جاؤ کرلو جاب، شوق سے کرلو۔ اگر ملتی ہے تو کرلو۔جو تنخواہ ہے ساری کی ساری تمہارے ہاتھ پر لاکر رکھ دیتا ہوں۔ اس رقم سے کچھ بچاسکتی ہو تو بچالو.....اور جو کچھ چاہتی ہو۔لے آؤ.....میرے کان

مت کھاؤ..... ایک بندہ باہر سے جاب کر کے آئے۔ دوسرا گھر میں بھی چین نصیب نہ ہو تو وہ مر نہ جائے ایسی زندگی سے۔''

شرمین اپنے شوہر کے ایسے تیور دیکھ کر ڈر گئی، چپ چاپ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ اس نے دل میں پلاننگ کر لی۔ وہ ضرور کہیں جاب تلاش کرے گی۔ تاکہ گھر میں آسودگی آ سکے۔ جاب کے لئے سکولوں کے چکر لگائے لیکن سب نے تجربہ مانگا۔ وہ پریشان سی لوٹ آئی۔ انہی دنوں سب بچوں کو باری باری ''آ کڑا ماکڑا'' نکل آیا۔ احتیاط، بخار، پرہیزی خوراک، وہ اب گھر میں بھاگی پھر رہی تھی۔

شبانہ جس کے آنے پر وہ خوشیوں اور بے فکری کے کبھی گیت گنگناتی تھی اب اس کی آمد ایک تھانے دار کی سی ہو گئی تھی۔ جس کے سامنے وہ مجرم تھی، اس کا جرم یہ تھا کہ ایک حق حلال کمانے والے کی بیوی تھی جس کے پاس حرام کے لقمے نہیں تھے۔ جو اس مہنگائی کے دور میں بچوں کی فیسیں، کتابیں، ٹیوشن، خوراک، لباس، بیماری، کسی عزیز کی شادی غمی پر ہی اپنے آپ کو پورا کرتے کرتے نڈھال سی ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس روز شرمین کا شوہر احسن گھر لوٹا تو شبانہ گھر کے دروازے پر ہی کھڑی شرمین سے کوئی اہم بات کر رہی تھی۔ شرمین کا چہرہ تھکا تھکا اور آنکھوں کی جوت بجھی بجھی تھی..... جبکہ شبانہ اس لمحے ایک اجلی کرن کی طرح چمکتی لہریں لیتی حسینہ لگ رہی تھی۔

احسن رکا..... چند ثانیے کے لئے ٹھٹکا..... اور پھر سلام کر کے اندر قدم بڑھا دیئے..... شبانہ نے اسے آواز دے کر روک لیا.....

''سنیے احسن بھائی! میں شرمین سے یہ ہی بات ڈسکس کر رہی تھی کہ بچوں کے امتحان سر پر آ گئے ہیں۔ ان کی انگلش بہت کمزور ہے۔ اگر آپ شام کو صرف ایک گھنٹہ پڑھا دیا کریں صرف امتحانوں تک تو بہت مہربانی ہو گی۔ مجھ سے بچے پڑھتے نہیں ہیں۔ نہ ڈھنگ سے سبق یاد کرتے ہیں۔ بڑے کاشف کی پچھلے سال کمپارٹ آ گئی۔ اب میں کہتی ہوں سالانہ امتحان ہے فیل نہ ہو جائیں۔ فرید صاحب کا بھی فون آیا تھا کہ بھائی صاحب سے کہہ دو مہربانی کر دیں۔ مجھے دراصل اچھا ٹیوٹر مل نہیں رہا۔ کوئی مل گیا تو ٹیوشن لگوا دوں گی۔ اکیڈمی ذرا دور ہے۔ یہ بچے تو چاہتے ہیں کہ پاپا موٹر سائیکل لے دیں اور وہ اڑتے پھریں۔ ابھی کار بھی انہیں اچھی طرح ڈرائیو کرنا نہیں آتی۔ کار کے لئے ڈرائیور رکھا تھا کم بخت زیادہ پیسے مانگ رہا تھا۔ میں نے چھٹی کروا دی..... میں نے سوچا ہے میں خود ڈرائیونگ سیکھ لیتی ہوں..... بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔''

''بھابھی جان! آپ بچوں کو خود توجہ دیں۔ آپ پڑھی لکھی ہیں۔ بچے آپ کی بات مان لیں گے۔''

''یہ نہیں مانتے۔ بہت ڈھیٹ ہیں۔ کاشف کے میٹرک کے امتحان نہ ہوتے تو میں اتنی فکرمند نہ ہوتی۔

آپ شام کو اپنے بچوں کو تو پڑھاتے ہی ہوں گے۔''

''شام کو شرمین ہی پڑھا دیتی ہے۔ میری ہمت نہیں ہوتی۔''

''پلیز احسن بھائی۔ صرف امتحان تک آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''اچھا دیکھیں..... میں خود تھکا ہوا آتا ہوں..... روز نہیں پڑھا سکوں گا۔ چند دن کی بات ہے تو پھر بھیج دیں۔ امتحان کب ہیں؟''

''صرف بیس روز رہ گئے ہیں اور وہ نالائق کے نالائق ہی پھر رہے ہیں۔ مجھے شدید فکر ہو رہی ہے..... اچھا میں بچوں کو بھیجتی ہوں۔''

احسن کا موڈ آف تھا۔ ''شرمین میرے سر میں درد ہو رہا ہے، ڈسپرین اور گرما گرم چائے کا کپ لے آؤ۔'' احسن اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''جی'' شرمین کہہ کر کچن میں چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

شبانہ کے بچے چند روز کے لئے آئے تھے۔ احسن نے جانے کیوں آہستہ آہستہ ان کی ذمہ داریاں اٹھالی تھیں..... امتحان بھی ہو چکا..... نئی کلاسز بھی شروع ہو گئیں..... بچے پھر بھی شام پڑتے ہی اپنی ماں کے ساتھ کتابیں اٹھائے چلے آتے۔

''آپ تھکے ہوئے آتے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا آپ منع کیوں نہیں کر دیتے۔ وہ بہت امیر خاتون ہے۔ وہ خود ٹیوٹر کا بندوبست کر لے گی۔ وہ کیوں نہیں دیتی ٹیوٹر کو اچھی تنخواہ۔ جبکہ وہ افورڈ کر سکتی ہے۔ ضرور آپ کا مغز چاٹتا ہے۔''

''افوہ بھئی! ہمسائیگی کے بھی بڑے حقوق ہیں۔ اب میں اتنا کورا بھی نہیں کہ زندگی میں پہلی بار انہوں کچھ کام دیا اور میں اس سے کنی کترا جاؤں..... پرانی دوستی ہے، اس کے میاں کا فون بھی گاہے گاہے آتا رہتا ہے۔ بڑا مشکور ہے اسطرح میرے پڑھانے پر۔''

لیکن یہ گھنٹہ نہیں تھا..... ساری شام اس کی نذر ہونے لگی تھی۔ شبانہ کبھی بچے چھوڑنے آتی۔ حالانکہ وہ سب بڑے تھے..... کبھی کوئی ٹیسٹ ہوتا وہ ڈسکس کرنے لگتی..... جب تک بچے ڈرائنگ روم میں پڑھتے وہ لاؤنج میں بیٹھ جاتی، شبانہ کے کپڑوں سے اٹھتی مہک شرمین کو پریشان کرنے لگی تھی۔

''یا اللہ! یہ پہلے کی طرح سادہ سی ہوتی..... تو دل کتنا مطمئن رہتا۔ اب وسوسے اندیشے ڈنگ مارنے لگے ہیں..... احسن کے رویے میں بھی وہ پہلی سی گرمجوشی نہیں رہی..... ہوسکتا ہے، احسن کی تھکن بڑھ رہی ہو..... یا اللہ احسن خود کب عقل استعمال کریں گے..... کیوں نہیں منع کر دیتے..... انکار کر دیتے؟''

شام کی چائے اکٹھے پیتے ہوئے وہ خود کتنی اذیت محسوس کرنے لگی تھی۔ جب بھی شبانہ کے ہاتھ کی بنی کوئی چیز کھاتے کہتے۔

''واہ بھی واہ..... مزہ آ گیا۔ میری بیگم کو بھی یہ چیز سکھا دو..... یہ پتا نہیں کسی جنگل کی پیداوار ہیں۔''

جبکہ احسن کو بخوبی علم تھا کہ شرمین نے جب بھی کریم..... میکرونی، یا نئی انوکھی ریسپی کے لئے بون لیس چکن مٹن اور چیز (Chcese) منگوائی ہیں تو اس نے فوراً ٹال دیا اور بات کل پہ ٹلتی رہی تھی یہ کہہ کر کہ ابھی وہ افورڈ نہیں کرسکتا یہ کباب، مٹن کڑاھی فش کے پکوڑے.....وغیرہ۔

''شرمین بھائی مذاق کررہے ہیں..... انہیں معلوم ہے تم جنگل کی ہرنی ہو..... میں تو پہلے دن سے ہی تمہاری ان موٹی آنکھوں پر مرمٹی تھی۔''

شبانہ نے تعریف کی تو اچھا لگا۔

''آپ ان آنکھوں کو ہرنی سے تشبیہہ دے رہی ہیں اور میں بھینس سے۔'' احسن ہنسا۔

''وقت وقت کی بات ہے..... کبھی ہرنی جیسی آنکھ لگی وہی اب بھینس جیسی لگ رہی ہے۔''

شبانہ نے جملہ کسا اور دونوں بے اختیار ہنس دیئے۔

شرمین پھیکی سی بے نام سی ہنسی ہنس دی..... حالانکہ اس کا دل اس وقت رونے کا چاہ رہا تھا۔ کہیں کچھ غلط تو نہیں ہورہا۔ یا میں ہی غلط سوچنے لگی ہوں.....وہ روزانہ نت نئے روپ میں گھر کیوں آجاتی ہے..... یہ بے تکلفی..... یہ خوشبوئیں..... یہ خوش لباسی..... میں کیوں شک کررہی ہوں.....؟ ایک پاکیزہ رشتے پہ شک کیوں کررہی ہوں.....؟

''اس عورت کے بچے ہیں..... اس کا اپنا شوہر ہے.....اس کی اپنی دنیا ہے.....شاید دوستی کے رشتے پرانے ہوجائیں تو انسان بہن بھائیوں کی طرح ہوجاتا ہے۔ صرف یہ گپ شپ ہے، میرا شوہر دل کا صاف اور کھرا آدمی ہے.....صرف بھولا ہے.....لحاظ اور مروت میں اس کے بچوں کو پڑھانے پر آمادہ ہے.....'' ٹی وی دیکھتے ہوئے بے معنی چینل بدلتے ہوئے وہ سوچے چلی گئی.....

☆.....☆.....☆

اور پھر اچانک شرمین کے شوہر کے پوسٹنگ آرڈر اسلام آباد کے لئے آگئے، ایک لمحے کے لیے شرمین کو افسوس ہوا.....لیکن شاید وہ اندر سے خود بھی اس تبدیلی کی خواہاں تھی۔ وہ شبانہ کی چمک دمک اور شخصیت کے سارے رنگوں کے سامنے بجھی ہوئی، تھکی تھکی راکھ کی مانند لمحہ لمحہ بکھرتی جارہی تھی..... اور وقت جیسے چپ چاپ اسے جلا جلا کر راکھ کرتا چلا جارہا تھا۔

نہ وہ اتنے مہنگے لباس خرید سکتی تھی۔ نہ اس کے پاؤں میں قیمتی سینڈل تھی، نہ وہ بیوٹی پارلر جاکر بار بار اپنا فیشل کرواسکتی تھی، نہ اتنی مہنگی کریمیں افورڈ کرسکتی تھی، نہ ہی وہ پیٹ کے چند انچ کم کرنے کے لئے جم جاسکتی تھی۔ تیز ہواؤں کے سامنے راکھ اپنا وجود کیسے برقرار رکھ سکتی ہے، کبھی نہیں.....شاید کبھی نہیں۔

☆.....☆.....☆

اور وہ دن بھی آگیا..... جب وہ دوسرے شہر چلے آئے۔ اس دن کے لیے وہ کتنی بے تابی سے منتظر تھی

تا کہ اپنا وجود اپنی شناخت ، اپنا چھوٹا سا گھروندہ تیز ہواؤں سے بچا سکے..... کسی آپا دھاپی، کسی ہنگامے کی فرصت نہیں تھی۔ دوستی قائم رہی، فون پر بات چیت ہوتی رہی..... بلکہ اس کا شوہر پاکستان آتا وہ سب فیملی سیر پہ نکلتی تو اسلام آباد میں اس کے گھر ضرور قیام کرتے۔ بہت لطف آتا..... گپ شپ، ہلا گلا..... بغیر کسی ٹینشن کے بہت اچھی لگتی۔

''بس تم رہیں وہیں کی وہیں.....'' شبانہ نے اسے اپنے حال میں مست دیکھ کر کہا۔

''کہہ دو کہہ دو جھجکو نہیں۔'' شرمین نے کہا۔

''یہی کہ اسلام آباد آ کر بھی لگتا ہے کہ چیچو کی ملیاں کی ہو۔ وہی پرانے پردے..... وہی گھر..... وہی چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔''

اسے اس بات پر غصہ نہیں آیا بلکہ شرمین اس کے سامنے بے ساختہ ہنسنے لگی۔

وہ اس رات اسے اپنے بیڈ پر اپنے قریب سلا کر کتنی خوش تھی۔ پتا نہیں شبانہ کو احساس تھا یا نہیں..... کہ کھرے اور سچے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں..... ان کی سادہ سی زندگی..... کم مائیگی، ایک طعنہ نہیں، تحفہ ہے..... کہ اس کٹھن مہنگائی کے دور میں بھی اپنا ایمان سلامت رکھے ہوئے ہیں۔ اگر شبانہ اسکی سادگی اور کروفر سے بے نیاز زندگی کا اس کی قوت خرید اور ایماندارانہ روش کا سوچتی تو اس سادہ سی سہیلی پر فخر کرتی..... لیکن دوسرے دن صبح اٹھتے ہی اس نے شور مچا دیا۔

''اُف توبہ، یار تم انسان ہو یا حیوان..... بجلی جا رہی ہے، بجلی آ رہی ہے۔ تم ایک یو پی ایس نہیں لگوا سکتے۔''

''وہ تھا جل گیا، نیا لینے کا سوچ رہے ہیں۔'' شرمین نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بس تم سوچتی رہنا اور سوچتے سوچتے بوڑھی ہو جانا۔'' شرمین پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ساری ایکسائٹمنٹ دھری کی دھری رہ گئی تھی..... تنخواہ دار متوسط شخص کا المیہ یہ ہے کہ وہ پائی پائی جمع کر کے ایک چیز بناتا ہے تو دوسری اس کے سر پر ضرورت کھڑی ہوتی ہے..... بچوں کی فیسیں..... کتابیں ہی مہیا کرنا دوبھر ہو رہا تھا..... کتنی مشکل سے نیا فرنیچر خریدا تھا۔ اور اے سی بھی کتنا ڈرڈر کے چلاتے تھے۔

وہ اسے پھر طعنوں کی زد میں لہولہان کر کے واپس لوٹ گئی تھی..... اس دن شرمین نے فیصلہ کر لیا.....

اب شبانہ سے نہیں ملنا، کبھی نہیں، یہ فاصلے جو دولت نے بنا دیئے ہیں وہ پاٹے نہیں جا سکیں گے۔ لاکھ خلوص ہو..... محبت ہو..... دولت کے ریلے کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ اسے یہ گھر بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اسے کوکنگ آئل پر بھی اعتراض تھا جس میں کھانے پکے تھے کہ وہ زیتون کا تیل کیوں نہیں استعمال کرتی۔ پھر اس کے واش روم میں امپورٹڈ خوشبوئیں، شیمپو کیوں نہیں ہیں.....

دونوں میاں بیوی فرید بھائی اور شبانہ پاکستان کی ہر چیز میں نقص نکال رہے تھے۔ وہ جلد ہی باہر جا رہے تھے.....ان کی گفتگو میں تفاخر کے ساتھ ساتھ دوسروں کی ہر بات میں نقص نکالنے کا کانٹا بھی موجود تھا۔

جب وہ بچوں کے سامنے پھر اسے بے وقوف اور جاہل جیسے خطابات سے نواز رہی تھی تو شرمین نے اسی لمحے سوچ لیا تھا کہ بس.....اب نہیں ملنا.....کبھی نہیں، وہ اپنی اور اپنے شوہر کی تذلیل اور برداشت نہیں کر سکتی۔ باہر بجلی چمک رہی ہو اسے اپنے گھر کے اندر آنے کا نہیں کہتے۔

شرمین کا شوہر بھی شبانہ کی تیز طرار گفتگو سن چکا تھا.....

وہ دونوں (شبانہ اور اس کا شوہر) ان کی پرانی محبتوں، چاہتوں اور خلوص پر فرد جرم عائد کر کے جا چکے تھے۔ انکی خاطر داریاں، خوشیاں سب بلبلے کی طرح ہوا میں بکھر گئی تھیں۔ احساسِ ذلت سے شرمین کمرے میں جا کر رونے لگی تھی.....''کیا کچھ نہیں کیا؟ اور کیا کچھ نہیں سنا۔ جب سب کچھ بدل گیا ہے تو اس بدلاؤ کو تسلیم کر لو۔ ہمارا اور ان کا کیا جوڑ.....جن کی چھٹیاں یورپ میں گزرتی ہوں، ان کے لئے ہمارا گھر کٹیا ہی تو تھا۔''

☆.....☆.....☆

وقت بدلا.....بچے سیانے ہوئے، شرمین کے تینوں بچے اعلیٰ ترین ڈگری لے کر ملک کے بہترین شہری بنے پھر سادگی سے ان کی شادیاں کر دیں..... اور احسن گریڈ 21 میں ریٹائرڈ ہوئے اور اسلام آباد کے مضافات میں سادہ مگر خوبصورت سا گھر بنا لیا.....تبھی انہیں کسی نے بتایا کہ شبانہ کے میاں نے دوسری شادی کر لی ہے، اور شبانہ پاکستان ہی آئی ہوئی ہے۔

پرانی محبتیں عود آئیں.....شرمین کی نظروں میں ماضی کے خوبصورت لمحے جگمگا اٹھے، پہلے سوچا فون کرے یا نہ کرے.....لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی..... شبانہ کا موبائل آن تھا.....آج دس سال بعد.....وہ اپنی پیاری سہیلی کی آواز سننے والی تھی۔ ہاں یہ وہی تھی۔

''ش شبانہ، یہ تم ہو نا.....میں شرمین بات کر رہی ہوں اسلام آباد سے۔''

''شرمین..... آں اچھا، تم..... اتنے سالوں بعد..... لیکن تم سے رابطہ تو میں نے توڑا تھا فون کیوں کیا.....مجھ جیسی بد بخت کو.....''

''خیریت معلوم کرنے کے لئے .....تم ٹھیک ہو نا.....؟''

''شرمین..... پانی..... تھوڑا ہو تو پیاس بجھاتا ہے، وہی طوفان بن جائے تو ڈبو دیتا ہے۔ تمہاری شبانہ اس دولت کے پانی میں ڈوب گئی ہے۔ پاکستان سے ساری جائیداد ہم پہلے ہی بیچ گئے تھے۔ بچے تو انگلینڈ Settle ہو چکے ہیں۔ اپنی اپنی مرضی کی شادیاں کر کے اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ میرے شوہر نے ایک ماڈل گرل سے شادی کی اور میں احتجاج کیا تو ایک

کاغذ میرے منہ پر مار دیا۔ اوہ..... (وہ رونے لگی) وہ طلاق کے کاغذات تھے..... اور پھر مجھے واپس پاکستان بھجوا دیا.....''

''تم کس کے پاس ہو آج کل۔''

''ایدھی سنٹر..... اولڈ ہوم ایدھی سنٹر.....'' وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ اسے لگا جیسے ساری کائنات تھم گئی ہے۔ آسمان پہ بادل لہرا رہے تھے..... کبھی دھوپ نکل آتی کبھی بادل اسے ڈھانپ لیتے شاید یہ دھوپ چھاؤں ہی زندگی ہے.....

شرمین کے ہونٹ اسے تسلی دینے کے لئے کھلے اور پھر وہ بھی چونگے پر چہرہ رکھے رونے لگی تھی.....

''میں کتنی نفاست پسند تھی شرمین..... کبھی میرے گھر آ کر دیکھنا۔ اب ایک لوہے کا پلنگ..... ایک میز..... لمبی سی بیرک..... اور بہت سی عورتیں.....''

شرمین سے اور زیادہ نہیں سنا گیا۔ اس نے تڑپ کر صرف اتنا کہا۔

''اور مجھے تم سے اس حالت میں بھی پیار ہے، تم میرے لئے اس طرح بھی قابلِ احترام ہو.....''

دوسری طرف سسکیاں لیتی ایک ٹوٹی ہوئی عورت کی آواز تھی جسے وقت کے پہیے نے کچل ڈالا تھا..... مادی چیزوں کے غرور میں جو سب کو بھلا بیٹھی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا.....

''وقت کیسے کیسے انقلاب لاتا ہے..... مجھے اس لمحے احساس نہ تھا..... آج احساس ہوا ہے کہ تو میں بالکل خالی ہاتھ ہوں.....''

''نہیں یہ ہاتھ ابھی بھی خالی نہیں۔ ان ہتھیلیوں میں دعاؤں کی سکت ہے..... اپنی عاقبت اور آخرت کی دعائیں.....''

فون پر سسکیاں لیتی آواز کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔

☆☆☆

وہ ایک انداز تیرا

جرمن شہر کلون کی فضاؤں میں کہر دھیمے دھیمے اتر رہی تھی۔ طلعت علی نے ماریو کے ساتھ بیڈمنٹن کی تیسری گیم شروع کرنے سے پہلے چہرے پر آئی نمی کو لباس میں لگے لوپ سے اٹکائے نیپکن سے تھپتھپایا اور پوزیشن پر آ گئی۔ ریکٹ والا ہاتھ ابھی اس نے بلند کرنا چاہا ہی تھا کہ کسی نے اس کو آواز دے کر بتایا کہ اس کے بیگ میں رکھا سیل فون خاصی دیر سے شور کر رہا ہے۔ گیم خاصی اچھی جا رہی تھی۔ اور پھر ماریو پورے ہفتہ بھر بعد کھیلنے آیا تھا۔ ایسے میں باوجود اترتی کہر کے وہ تیسری گیم کھیلنے کو تیار تھی حالانکہ اب کہر اتنی زیادہ تھی کہ شٹل کاک ہٹ کرنے میں خاصی مشکل تھی۔ کھیل ختم کرنا ہی تھا لیکن اس طرح فون کی اطلاع نے اس کو بدمزہ کر دیا تھا۔ اس کو پورا یقین تھا کہ یہ امرتا ہوگی۔ ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ دل ہی دل میں بدمزہ ہوتے اس نے ماریو کو گیم ختم کرنے کا اشارہ کیا اور ڈھیلے قدموں سے فاصلے پر رکھے ریک کی جانب بڑھ گئی جہاں اس کا بیگ رکھا تھا۔

بیگ سے فون نکالنے سے پہلے ایک دم اسے جھٹکا لگا۔ پیچھے سے کسی نے اس کو گدگدی کر دی تھی۔ سرعت سے مڑ کر اس نے دیکھا وہاں ماریو کھڑا ہنس رہا تھا۔ ماریو کو ہنستا دیکھ کر بھی اس کے تنے اعصاب میں فرق نہ پڑا لیکن باوجود لمحے قبل کی ناگواری کے اس نے ماریو کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما اور پھر دونوں جلد ہی خوشگوار انداز میں باتیں کرتے نرم گھاس کو روندتے ٹہلنے لگے۔ ''کیا تمھیں میرا گدگدی کرنا برا لگا تھا؟'' ماریو نے طلعت علی کے چہرے پر ہونٹوں کے قریب پڑے ڈمپل کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ لمحے بھر کو چپ ہوگئی۔ ''ہاں لگا تو تھا برا'' دھیمے سے کہتے ہوئے اس نے کہر کی بنا پر اترتی ٹھنڈ کو اپنے جسم میں داخل ہوتا محسوس کیا اور ہاتھ میں تھامی جیکٹ چڑھا لی۔ ''ات اپنا کیریئر یہیں بناؤ کیوں پاکستان جا رہی ہو۔ وہاں ہے ہی کیا سوائے دہشت گردی کے'' ماریو کی بات سن کر طلعت علی نے اس کو دیکھا جہاں بھوری آنکھوں میں طلعت علی کا عکس اتر کر لہجہ کو بوجھل بنا گیا تھا۔ اس نے بھی اپنے دل میں لہروں کی گردش محسوس کی اور بے اختیار ماریو سے قدم آگے بڑھا لیے۔ دو چار قدم آگے جا کر اسے احساس ہوا کہ ماریو اس کے ساتھ نہیں ہے۔ تیزی سے مڑ کر اس نے دیکھا تو وہ اسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے اس نے قدم آگے بڑھائے تھے۔ ماریو کی جانب پلٹتے ہوئے وہ اپنے اندر اداسی کی لہر محسوس کر رہی تھی۔ بنا کچھ کہے دونوں گھاس پر چلتے ہوئے سامنے بنی عمارت کے

قریب رکھے ریک سے اپنا سامان اٹھانے بڑھ گئے۔

فضا میں سبزہ کی باس پھیلی ہوئی تھی۔ کہر دیکھتے ہی دیکھتے خاصی گہری ہوگئی تھی۔ وہ دونوں آج پورے ہفتہ بھر بعد کھیلنے اسپورٹس کلب آئے تھے۔ طلعت علی کلون جرمنی میں اپنے ماموں کے پاس پچھلے دو سال سے رہ رہی تھی۔ آئی وہ یہاں محض وزٹ ویزا پر تھی لیکن مامی کے بے حد اصرار پر اس نے یہاں ان کورسز کی تلاش شروع کر دی جو انگریزی میں پڑھائے جاتے ہوں اور اس کی بی ایس سی کی ڈگری سے مطابقت بھی رکھتے ہوں۔ ایسا کوئی کورس اس کو ملا تو نہیں لیکن جرمن زبان سیکھنے کے لیے اس نے یونیورسٹی میں ایڈمشن لے لیا تھا۔ ماموں مامی بے اولاد تھے، طلعت علی کے ساتھ ان کا وقت خاصا خوشگوار ہو جاتا تھا۔ سو اسے جرمنی میں رکھنے کے لیے انھوں نے ہر طرح کی مدد کی۔ ایڈمشن کے لیے کاغذات لینے اسے واپس پاکستان آنا پڑا۔ دوبارہ ویزہ ملنا اتنا آسان نہ ہوتا اگر ماموں اپنے کسی جرمن پروفیسر دوست کی مدد طلعت علی کے لیے نہ مانگتے۔ اور یوں طلعت علی پورے دو سال کے لیے جرمنی آ گئی۔ جانے سے پہلے خالہ نے عباس محمود کے نام کی انگوٹھی اس کو پہنا دی تھی۔ اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ نہ منگنی پر اور نہ عباس پر۔ وہ تھا ہی چاہے جانے کے قابل۔ خاندان کا لائق فائق لڑکا اور شائستہ عادات والا۔ جانے سے پہلے اس نے طلعت کو لکڑی سے بنا ایک کی چین دیا تھا جس پر ایک جانب از طرف عباس محمود کندہ تھا تو دوسری جانب ''محبت زندگی کا نغمہ ہے'' لکھا تھا۔ طلعت علی نے عباس کے لیے دل میں جذبہ پھوٹتا محسوس کیا اور پھر وہ جرمنی پہنچ گئی۔ ماموں کو اس کی منگنی پر اعتراض تھا لیکن انہوں نے سرسری سی بات کے علاوہ کبھی کچھ نہیں کہا۔ ان کا خیال تھا کہ طلعت کو اپنا مستقبل یہاں بنانا چاہیے۔ یہاں ایک سے ایک قابل بھرا پڑا ہے۔ اس سے کہیں بڑھ کر۔ انہوں نے بس ایک مرتبہ ہی کہا تھا جسے طلعت علی نے اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن یہ بات کہیں تحت الشعور میں محفوظ رہ گئی تھی۔ ماریو کے ساتھ وقت گزارتے یہ جملہ ابھر آتا تھا اور عباس محمود کا تصور دھندلا جاتا۔ عباس اور اس کا رابطہ آن لائن ہوتا ہی رہتا تھا، ایسا نہ تھا کہ عباس قصہ پارینہ کی طرح کہیں دور جا چکا تھا۔ وہ اسی طرح تازہ تھا جیسے پاکستان سے آتے وقت طلعت علی نے محسوس کیا تھا لیکن اب دن بدن اسکی پوزیشن میں اور اثر پذیری میں فرق آتا جا رہا تھا۔ ایسا جب سے ہوا تھا جب ماریو نے طلعت علی کی چھلی ہوئی کہنی پر فرسٹ ایڈ کٹ سے میڈیکیٹیڈ ٹیپ نکال کر چپکائی تھی۔ بس چھ ماہ قبل ہی وہ بائیسکل رائیڈر گروپ کے ساتھ پینتیس کلومیٹر کی تفریحی ریس میں شریک تھی۔ ماموں نے اس ریس کے لئے طلعت علی کو خصوصی سائیکل مہیا کی تھی۔ وہ خود بھی ساٹھ برس کے ہونے کے باوجود خاصے ایکٹو تھے اور اسے بھی ایکٹو ہی دیکھنا چاہتے تھے مگر طلعت کے لئے اس کی سواری آسان نہ ہوئی اور وہ ایک مقام پر رفتار تیز کرنے کی لگن میں توازن برقرار نہ رکھ سکی،

سائیکل سے گرتے ہوئے اسکی کہنی مڑ گئی تھی، مڑنے کی تکلیف سے اسکی سسکیاں نکلنے لگیں۔ اس کے ساتھ کے سوار تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے، کسی کو اندازہ نہ تھا کہ کوئی کس قدر تکلیف میں ہے۔ ایک منٹ گزرا، دو منٹ گزرے، اس نے کھڑے ہوتے ایک ہاتھ سے سائیکل تھام کر قدم اٹھانے کی کوشش کی مگر تکلیف شدت کی تھی اب سواروں میں سے کوئی بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ راستہ بھی خاصا غیر آباد تھا۔ موبائل اس نے ایک ہاتھ سے نکال کر استعمال کرنا چاہا بات بھی وہ نہ کر پائی۔ ابھی وہ اسی سوچ میں تھی کہ کیا کرے اس نے کسی سائیکل سوار کو دیکھا۔ سائیکل پر لگے مخصوص چمکدار سٹیکر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اسی گروپ کا ممبر ہے وہ جس میں طلعت علی تھی۔ آنے والے نے طلعت علی کے قریب پہنچ کر اپنا ہیلمٹ اتارا اور ایک نگاہ ڈال کر اپنی کٹ نکال لایا۔

''آؤ ادھر بیٹھو۔'' طلعت کو قریبی بینچ پر بٹھاتے ہوئے اس نے اس کے دکھتے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ سسک پڑی۔ ''مڑ گیا ہے کیا؟ یہ تو چھل بھی گیا ہے۔'' اس نے سوال بھی کیا اور اطلاع بھی دی۔ طلعت نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے باکس میں اینٹیسیپٹک دوائی میں بھیگی کاٹن نکال کر پہلے اس کی کہنی صاف کی اور پھر ٹیپ چپکا دیا۔ بازو کو تھامتے ہوئے اس نے خفیف سا اسے موڑا تو طلعت علی کی چیخ نکل گئی۔ ''کچھ نہیں ہوگا، ایسے دو چار بار حرکت سے تم کچھ ہی دیر میں بہتر محسوس کرو گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے پھر آہستگی سے ہاتھ کو جنبش دے دی۔ اب کے طلعت علی نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑانا چاہا تو مزید درد ہونے لگا۔ ''تم عجیب ہو میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اس طرح بہتر محسوس کرو گی اور تم الٹا اپنا بازو مجھ سے کھینچ رہی ہو۔'' یہ بات نرمی سے کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر طلعت کے ساتھ وہی عمل کیا۔ اب کے وہ خاموش رہی ایک بار اور اس نے اسی طرح کیا اور پھر بازو کو آہستگی سے چھوڑ دیا۔ طلعت علی کو حیرت تھی کہ یہ کون ہے اور کیسے پلٹ کر اسے دیکھنے آیا ہے۔ ''میں ماریو ہوں۔ اس ٹیم کا نگران۔ میرا کام ہی یہ ہے کہ تمام ممبرز کا دھیان رکھوں۔ لگتا ہے تم پہلی بار ایسے کسی گروپ میں شریک ہوئی ہو۔'' طلعت علی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔ ''تمہاری آنکھوں کا رنگ کچھ کچھ گھاس سے ملتا جلتا ہے۔'' اس نے طلعت علی کی سبز مائل آنکھوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اسکی سائیکل تھام کر اپنی سائیکل کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ گویا یہ اشارہ تھا کہ طلعت علی بھی اٹھ کر اس کے پیچھے آئے۔

ماریو کی سائیکل ریسرز کی سائیکل سے مختلف تھی، کیونکہ وہ ان سب کی نگرانی کر رہا تھا۔ ایسے میں کسی چھوٹے موٹے حادثہ کی صورت میں اسے کسی سوار کو اپنی سائیکل پر بٹھانا بھی پڑتا تھا۔ اور اس کی سائیکل کو بھی سنبھالنا ہوتا تھا۔ طلعت کی سائیکل کو اپنی سائیکل کے ساتھ چین اور کچھ آنکڑوں کے ساتھ منٹوں میں جوڑ دیا۔ ''یہ کوئی بہت اچھا آپشن نہیں ہوتا سائیکل کے لئے لیکن

اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور طلعت کو سائیکل سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود ہینڈل تھام کر چلنے لگا۔

طلعت نے ڈھیروں شرمندگی کے ساتھ اس کو دیکھا جس نے اپنا نام ماریو بتایا تھا۔ یہ پہلی ملاقات تھی، اور پہلا لمحہ تھا جب عباس محمود دھندلایا اس نے عباس محمود کو کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ ہاں وہ مسکراتا ضرور تھا۔ لیکن طلعت علی جیسی بات بات پر ہنس پڑنے والی کو ماریو کی ملاقات سے قبل عباس میں یہ کمی محسوس نہ ہوئی تھی۔ پہلی ہنسی ہی میں طلعت نے غور سے ماریو کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے کوئی بچہ ہنس رہا ہو۔ بے فکری اور بے نیازی کے ڈھیروں بلبلے فضا میں پھیل گئے تھے۔ طلعت علی نے جب جان لیا تھا کہ ماریو بات کم کرتا ہے اور ہنستا زیادہ ہے اور اسکے ہنستے ہی جیسے دھنک رنگوں کے بلبلے پیدا ہونے لگتے ہیں جو اس کو چھوتے ہیں تو گدگدی سی ہوتی ہے۔

ماریو کی ماں جرمن عیسائی اور باپ پاکستانی مسلمان تھا۔ ماریو جرمن ضرور تھا لیکن مذہباً کیا تھا وہ خود فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ عیسائی کہ مسلمان۔ کلیسا محور بنائے یا مسجد سے دل لگائے۔ وہ پچیس سال کی عمر تک یہ طے ہی نہ کر پایا تھا۔ ماں اور باپ دونوں نے بظاہر اس پر کوئی دباؤ نہ ڈالا تھا لیکن پھر بھی وہ ان دیکھا بوجھ محسوس کرتا تھا۔ جیسے ماں اس سے کلیسا کی جانب قدم بڑھانے کا کہتی ہو اور باپ کے آئی فون سے اٹھتی قرأت کی آواز اسے اپنی طرف کھینچتی ہو، تنگ آ کر اس نے نیوٹرل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر اسے بنگال سے آئی امرتا ملی۔ ساحرانہ آنکھوں اور گھٹاؤں جیسے سیاہ بال جن کی لمبائی ہی ماریو کو حیرت انگیز لگتی تھی۔ وہ ہندو تھی پوجا کی خاصی عادی، ماریو نے مذہبی تشنگی کے باوجود کبھی اس کے اعتقادات میں کشش محسوس نہ کی الٹا کبھی وہ امرتا کو اس کے کمرے میں رکھے بت کے آگے ماتھا ٹیکتے دیکھتا تو بت پر موجود غیر فطری تاثر اور امرتا اسے ایک کُل کے حصے لگنے لگتے، عموماً وہ وہاں سے ہٹ ہی جاتا۔ اس نے تو آسمانی ہدایتوں والے دین کی روشنیاں دیکھی تھیں۔ چاہے وہ اس میں جذب نہ ہوئی تھیں لیکن عیسائیت اور اسلام دونوں ہی کے ماخذ آسمانی تھے۔ عیسائیت کتنی بھی پراگندہ انسانوں نے کردی ہو، بتوں کے آگے سر جھکانے سے بظاہر بہتر ہے۔ یہ خیال ماریو کو اس وقت ضرور آتا جب اس کے دوست ہر اخلاق باختہ کام کرتے لیکن یسوع مسیح سے محبت کے اظہار کے طور پر رضا کارانہ کچھ وقت لوگوں کی جی جان سے خدمت بھی کرتے۔ ایسا سب نہ کرتے تھے مگر جو بھی کرتا اس کے چہرے پر ماریو کو روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب فادر کی برکات ہیں۔ فادر جو آسمان سے اترے تھے۔ ان مٹی کے مجسموں کی طرح نہیں جن کی بے ڈھب ہیئت سے ہی اسے امرتا کی عقل پر حیرت ہوتی تھی۔ کیسے وہ ان سے والہانہ عقیدت رکھتی ہے۔ امرتا سے اس پہلو پر وہ اتفاق نہ کرتا تھا لیکن پھر بھی اس

کی امرتا سے بہت دوستی تھی۔ وہ دونوں نیوکلیئر سائنس میں ماسٹرز کررہے تھے حیرت انگیز طور پر امرتا نہایت مہارت سے جرمن بول بھی لیتی تھی اور سمجھنا بھی اس کے لئے آسان تھا۔ اس لئے باوجود جرمن زبان میں تعلیم کے وہ نیوکلیئر سائنس کی اچھی طالبہ تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی حکومت نے اسے اسکالرشپ پر جرمنی بھیجا تھا۔ جب وہ اپنی جھیل سی گہری آنکھوں میں چاہت کے دیئے جلا کر ماریو کو دیکھتی تو ماریو کو لگتا جیسے اس کے اردگرد دھیما دھیما سا دھواں سا پھیل رہا ہو۔ اس میں سے اسے کوئی اجنبی خوشبو بھی اٹھتی محسوس ہوتی، نہ جانے امرتا کو نسا منتر جانتی تھی کہ ماریو بس اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب طلعت علی اور ماریو کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اور اس ریس میں امرتا اپنے کسی تہوار کی بنا پر شریک نہ ہوسکی تھی۔ ورنہ ماریو امرتا کے بنا شاید ہی کبھی نظر آتا تھا۔ وہ اگر چاہتا بھی تھا تو امرتا کی آنکھوں کا سحر اسے جیسے جکڑ لیتا تھا۔ اکثر اسے لگتا امرتا کوئی جادو جانتی ہے جس نے اسے باندھ دیا ہے۔ اپنی سوچ کو وہ امرتا سے بانٹتا تو وہ ہنس دیتی ''ہاں پریم کے جادو سے۔'' اسکی آنکھوں میں پھر وہی کیفیت ہوجاتی جب ماریو کو دھوئیں اور اس میں سے آتی خوشبو کا تجربہ ہوتا تھا۔ حیرت تھی کہ کبھی کسی نے امرتا کے ساتھ ایسی کسی مختلف کیفیت محسوس نہ کی تھی۔ ماریو کے اور امرتا کے کچھ دوست مشترک تھے۔ وہ سب ماریو کی اس بات کو ہنسی میں اڑا چکے تھے۔ ماریو کو دھوئیں اور اس خوشبو سے اپنا ذہن سویا ہوا لگنے لگتا تھا۔ ایسے جیسے خوابیدہ ہو چکا ہو۔

وہ نیوکلیئر سائنس کا بہت لائق طالب علم تھا۔ آثار بتاتے تھے کہ اس میدان میں اس نے ایسے کارنامے دکھانے ہیں جو تاریخ رقم کرے گی۔ مگر امرتا، دھواں اور خوشبو ایسا معمہ تھا جو اسے سمجھ نہ آتا تھا۔

طلعت علی کوئی ایسی حسین لڑکی نہ تھی کہ ماریو گھائل ہوجاتا۔ ایسا حسن اس نے بہت دیکھا تھا۔ جرمنی میں بہت سے ٹرکش نوجوان لڑکے لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ خود اس کے کئی شناسا ترک مسلمان تھے، جن کی موتی سی رنگت اور مختلف رنگ کی آنکھیں تھیں۔ طلعت علی کو حسن کے حساب سے درجہ دیا جاتا تو وہ ماریو کی دوست لڑکیوں سے کم ہی ہوتی۔ لیکن پھر کیا بات تھی کہ اس کے ساتھ ماریو کو وقت گزارنا بہت اچھا لگتا تھا۔ امرتا کا سحر بھی حیرت انگیز طور پر اتنا طاقتور نہ رہا تھا کہ وہ طلعت کی جانب رخ نہ کرپاتا۔ جو اس کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلنے کلب آتی، کچھ دیر گپ شپ میں وقت گزارتی اور لوٹ جاتی، اس نے ماریو کو ایک خاص حد فاصل پر رکھا تھا۔ ہاں ماریو کے ساتھ لمحے گزارتے اس کے چہرے پر جیسے افشاں سی برسنے لگتی تھی اور عباس محمود مزید مدھم ہوجاتا۔ طلعت علی جرمنی محض دو سال کے ارادے سے آئی تھی۔ پھر اسے پاکستان عباس محمود کا بننے واپس لوٹ جانا تھا۔ وہ چاہتی بھی تو اس حقیقت کو نہ جھٹلا سکتی تھی کہ وہ عباس محمود کی منگیتر ہے، اور اسے بلآخر زندگی اسکے نام کے ساتھ جڑ کر ہی گزارنی ہے۔ لیکن

معاملہ دل کا مختلف تھا۔ ماریو سے مل کر اس کو حقیقتوں سے فرار کی تلاش ہونے لگی تھی۔ ماریو کے ساتھ کی بنا پر وہ بیک وقت کتنے محاذوں پر مصروف تھی۔ امرتا کو ماریو کے گریز کی وجہ ملتے ہی وہ طلعت علی کو ہر طرح سے عاجز کرنے کی کوشش میں تھی۔ کبھی طلعت علی کو اپنے کمرے کی بند کھڑکیوں پر سائے منڈلاتے محسوس ہوتے تو کبھی اسے لگتا پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اس کے کمرے میں بلند ہو رہی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا اس کے ساتھ کیوں ہونے لگا ہے لیکن ڈر کے عالم میں امی کی یاد کرائی گئی دعائیں بڑی کام آتیں۔ سائے بھی چھٹ جاتے اور پرندے بھی غائب ہونے لگتے۔ وہ نمازوں کی باقاعدگی سے پابند نہ تھی لیکن ایسے واقعات سے اسے یوں لگا جیسے یہ قدرت کی طرف سے سگنل ہے کہ اگر وہ عبادت کے حصار میں نہ آئی تو کرہ ارض پر پھیلی لاتعداد شرّ ی قوتوں میں سے کوئی بھی اس پر کسی وقت حملہ کر سکتا ہے۔ ایسے میں جب کہ وہ نہتی ہو اور کسی بھی طرح کی مدافعتی قوت نہ رکھتی ہو۔ اس نے کمرہ بھی عارضی طور پر تبدیل کر کے دیکھ لیا تھا اور ماموں، مامی سے کیفیت کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ ماموں کا خیال تھا کہ طلعت کو زندگی میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ وہ ماریو کے ساتھ اس کی لگن کو جان چکے تھے، ''تمہارے ذہن پر عباس محمود کا دباؤ یہ سب پیدا کر رہا ہے، عبادت تمہیں فائدہ جب دے گی جب تم معاملہ کو صاف کر دو گی، آیا تم نے عباس کے ساتھ اپنے پاکستان لوٹنا ہے یا یہاں ماریو کے ساتھ جرمنی میں۔'' ماموں نے طلعت علی کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے اسے نرم لہجے میں اپنا خیال بتایا تو وہ ہوں کر کے رہ گئی۔ ''ماموں کیا ایسا ممکن ہے؟'' اس نے سر گھما کر ماموں کو دیکھا تو وہ خاموش رہے۔ ''ماموں بالفرض عباس سے میں علیحدہ ہو بھی جاؤں تو ماریو کے دین مذہب کے ساتھ میرا رہنا ممکن نہیں۔'' وہ بولی تو اس کی آواز میں قطعیت اور نمی دونوں ہی صاف تھیں۔

ماموں نے بہ غور اس کو دیکھا۔ وہ بیس سال کی عمر میں جرمنی آ گئے تھے۔ اس وقت جب دیس کوئی کوئی چھوڑتا تھا۔ اور اس خطہ کا رخ تو شاذ و نادر ہی لوگ کرتے تھے۔ ان کے پڑوس میں رہنے والے کوئی صاحب جرمنی حکومت کی جانب سے ٹریننگ پر گئے تھے۔ واپس آئے تو اسی ملک کے قصیدے پڑھتے ہوئے، تب طلعت علی کے ماموں نے بھی ملک چھوڑنے کی ٹھان لی تھی۔ ان کے لہجے میں قدرتی ہکلاہٹ تھی۔ طنزیہ فقروں اور نظروں نے ایک بہترین دماغ کو چار دیواری میں محدود کر دیا تھا۔ زمین اور اسکی ساخت سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ وہ جیالوجسٹ بننا چاہتے تھے لیکن کوئی مذاق اڑاتا نام دل کے آئینہ کو ایسا کرچی کرتا کہ دماغ کی ساری صلاحیتیں گم ہونے لگتیں۔ ماں، باپ، بہن، بھائیوں کے دلاسے بھی عثمان کی ضائع توانائی کو بحال کرنے کی کوشش میں رہتے لیکن وہ اس ماحول سے نکل جانا چاہتے تھے۔ بلآخر ستر کی دہائی میں ابا، اماں نے ان کو

بڑے غمزدہ دل کے ساتھ جرمنی بھیج دیا۔اور پھر وہ ایسے گئے کہ کبھی ملک لوٹنے کی خواہش ہی نہ کی۔ جب تک اماں، ابا زندہ رہے اس وقت تک عثمان کو ملک کی اور انکی کشش کھینچ لاتی تھی۔ وہ آتے سال بہ سال، پورے ماہ رکتے اور مجال ہے جو گھر کے سوا کہیں اور جانے کی خواہش کرتے ہوں۔ زندگی نے انہیں بڑی فراخی سے عزت، قابلیت اور مرتبہ پردیس میں عطا کر دیا تھا۔ وہ وہاں مطمئن تھے لیکن رشتوں سے دوری کی تشنگی محسوس کرتے تھے، تبھی دیس کی فضائیں یاد آتیں لیکن ائیر پورٹ کی عمارت سے ہی ان کو وہی احساس زندہ ہوتا محسوس ہوتا جسکی بنا پر وہ دیار غیر میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ چونکتی، ٹھٹکتی، سوال اٹھاتی نگاہیں۔ مسکراتے لب جیسے کہہ رہے ہوں ہکلا بے چارہ! ان ہی لفظوں کی گونج وہ بہ خوبی محسوس کرتے تھے۔ دو بہنوں کی شادیاں ہوئیں اور دو بھائیوں کی، عثمان ملک کی جانب سے اعلیٰ ترین تحفہ ہوتا لیکن وہ کبھی کسی بھی شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ ان کو تقدیر سے رب سے شکوہ کبھی نہ ہوا تھا۔ لیکن انسانوں سے خصوصاً ان انسانوں سے شکوہ شدید تر تھا جن کے دین ہی میں رب کائنات کا ارشاد موجود تھا۔ ''خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے کے لئے۔'' (سورۃ ھُمَزَۃ) عثمان ملک کو اپنا رب بڑا ہی ماڈرن اور بڑا ہی رحیم لگتا جس نے مخلوق کے کانچ کے سے نازک احساسات کا اس حد تک خیال رکھا کہ اپنی مقدس ترین کتاب میں انسانوں کو تنبیہہ کی کہ ہر مذاق اڑانے والی کیفیت دین اسلام میں ممنوع ہے۔ اور جو کوئی بھی ایسا کرے اس کے لئے خرابی ہے۔ ہر طرح کی، تصور کو پھیلاؤ جھرجھری آئے جائے، لوگ سوچتے کیوں نہیں وہ اکثر اس سورۃ کو پڑھ کر سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ عربی نہ جانتے تھے لیکن ترجمہ قرآن پڑھنا پسند تھا۔ اور سورۃ ھُمَزَۃ سے تو جیسے انہوں نے رب کی مخلوق سے محبت کو جانا تھا۔

اب جب کہ طلعت علی نے ماریو کا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا۔ انکی آنکھیں روشن سی ہوگئی تھیں۔ ''اور ماریو دین بدل لے تو؟'' عثمان ملک نے پرسوچ لہجے میں سوال کیا، خود انہوں نے جرمن عورت سے ہی شادی کی تھی جو عثمان ملک سے شادی سے قبل مسلمان ہو چکی تھی۔ نہ جانے کیوں انکو یقین تھا کہ ماریو بھی ایسا کر لے گا۔ طلعت علی کا دل جیسے جگنوؤں سے بھر گیا۔ اس سوال پر اس نے ماموں کو چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے افسردگی اس کے چہرے پر تن گئی ''پھر بھی ماموں عباس اور یہ انگوٹھی، اسکا میں کیا حل نکالوں۔'' اس نے بائیں ہاتھ میں پہنی مرجان کی اس خوبصورت انگوٹھی والی انگلی کو حرکت دی۔ ''کیا عباس اور تم آپس میں کوئی.....'' ''نہیں ایسا کوئی خصوصی تعلق بظاہر تو نہیں ہے اور نہ تھا۔'' اس نے ماموں کی بات پوری ہونے سے قبل ہی مطلب جان کر جواب دے دیا۔ ''بظاہر؟'' ماموں نے بظاہر لفظ کو دہرایا اور سوچ میں پڑ گئے۔ ''ڈیئر بظاہر اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے، تم

کوہوسکتا ہے ماریو کے سامنے عباس سے ناطہ توڑنا مشکل نہ لگے، اور سچ بات یہ ہے کہ میں بھی چاہتا ہوں کہ ماریو اورتمہارا ساتھ ہوجائے، لیکن بہرحال عباس کا معاملہ میں نہیں جانتا، ہوسکتا ہے وہ تم سے خاص تعلق رکھتا ہو پھر تمہاری پوری فیملی ہے، تمہارا فیصلہ سب کو ہی سہنا پڑے گا۔'' ماموں نے سامنے دیوار پر لگی تصور پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا جس میں درختوں کے تنے پر بیلیں لپٹی تھیں۔ ''پھر؟ پھر ماموں کیا کروں میں؟'' اب کہ عثمان ملک کو لگا جیسے وہ رو پڑے گی۔

عثمان ملک خاصی بے چینی محسوس کررہے تھے۔ وہ اپنی نہایت عزیز بھانجی کی تکلیف بہ خوبی محسوس کررہے تھے، اس کا دل ان کو تڑپا رہا تھا لیکن کسی بھی طور پر وہ عباس محمود کے لئے اس کو راغب کرنے کے الفاظ اپنے اندر سے امنڈتے نہ پارہے تھے۔ حالانکہ سمجھ رہے تھے کہ اس کے لئے سہولت اور آسانی کا راستہ یہ ہی ہے کہ وہ جس سے منسوب ہوکر آئی تھی اس سے ہی عزت واکرام کے ساتھ رخصت ہوکر اپنے پیاروں میں زندگی گزارے۔ امرتا، ماریو اور طلعت علی تینوں کے بارے میں انہیں معلومات تھیں۔ انہوں نے طلعت علی کی سرگرمیوں کی جانب سے کبھی لاپرواہی نہ برتی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ طلعت کی ماریو کے جانب سے بڑھتے جذبات اور قدم پر انہوں نے کوئی جنبش نہ کی، وہ دل سے چاہتے تھے کہ طلعت علی جوان کو اپنا جگر کا ٹکڑا محسوس ہونے لگی تھی، یہیں جرمنی میں رک جائے۔

رشتوں کی کمی عمر کے اس حصے میں انہیں بے چین کردیا کرتی تھی۔ انہوں نے اماں، ابا کے بعد دیس جانا بند کردیا اور دیس والوں کے لئے ان تک آنا سہل نہ تھا۔ سو رشتوں کے ساتھ ان کا تعلق سوکھتا چلا گیا، وہ تو طلعت علی تھی، جس نے ٹھان لی تھی کہ کچھ بھی ہو اس ماموں تک جانا ہے جن کا نام اس نے آنکھ کھولتے ہی سنا تھا۔ ''یہ طلعت تو ہو بہو عثمان ہے۔'' وہ یہ جملہ اپنی ماں، خالہ اور عباس محمود کے والد فضل محمود سے اکثر سنتی تھی۔ پھر بی ایس سی کرنے کے بعد اس نے اپنے ماں، باپ سے اصرار کرکے جرمنی ماموں کے پاس جانے کی فرمائش کردی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ محض رسمی سا تعلق عثمان ملک اور ان کے درمیان تھا۔ ایسے میں طلعت علی کا یہ لاڈ علی متین اٹھاتے گھبرا رہے تھے۔ کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو بڑے ناز ونعم سے پالا تھا۔ خوشحال گھرانا تھا، سو اسکے ہر ناز اٹھائے گئے تھے، لیکن اس طرح کہ شر اس کی سرشت میں داخل نہ ہو۔ انہیں اپنی تربیت پر بھروسہ تھا سو یہ فرمائش بھی اسکی سنی گئی اور وہ جرمنی پہنچ گئی، حیرت کی بات یہ سب کو ہی لگی کہ عثمان ملک نے طلعت علی کی آمد کا سن کر بہت خوشی کا اظہار کیا، لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ عثمان ہی ہیں جو عرصے سے لئے دیئے رہنے لگے تھے، نہ جانے عثمان ایسے کیوں ہوگئے تھے، والدین کی زندگی میں تو ایسی کوئی کھچاوٹ محسوس نہ ہوتی تھی۔ سب بہن بھائی جب بھی آپس میں ملتے عثمان کو ضرور یاد کرتے اور ان کے گریز کو دیار غیر سے ملنے والی توقیر واکرام کا سبب سمجھتے ''عثمان میں کلف لگ چکی ہے۔'' عثمان سے بڑے

فرحان بھائی کو خاصا یاد کرتے تھے، اس لئے عثمان کا رویہ ان کو بہت کھٹکتا تھا۔ ایسے میں طلعت کی آمد پر عثمان کی گرمجوشی کو سب نے مبارک تصور کیا تھا۔ ان کو امید تھی کہ ان کا بھائی پھر سے ان سے آ ملے گا۔ اس لئے سب نے ہی طلعت کے زیادہ سے زیادہ رکنے کو غنیمت جانا۔ خون کی کشش اپنی جگہ لیکن عثمان ملک کی لیاقت اور مقام کی بھی مقناطیسیت کم نہ تھی۔ پھر انسان دوسرے انسان پر کسی نہ کسی غرض کی بنیاد پر ہی جذبے نچھاور کرتا ہے۔، یہ اس کی فطرت ہے، صرف ماں، باپ کا رشتہ رب نے ایسا بنایا ہے کہ جو بنا کسی غرض کے اپنا آپ اولاد پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ ان دونوں ہستیوں میں سے ماں، باپ سے کہیں آگے ہے۔ اس لئے ہی خالق نے اپنی محبت مخلوق سے ظاہر کرنے کے لئے صرف اور صرف ماں کی محبت کی مثال دی ہے۔ سب ہی بہن، بھائیوں کو عثمان کی طلعت کے لئے لگن سے ایک نیا روزن کھلتا لگا تھا۔ پاکستان سے جرمنی تک رابطے بڑھنے لگے تھے۔ نوجوان آنکھوں نے کتنے ہی خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔

لیکن دو سال میں عثمان ملک میں طلعت کے سوا کسی اور کے لئے نرم گرم سا تاثر کوئی خاص ابھرتا نہیں لگا۔ فرق ضرور پڑا مگر نمایاں نہیں تھا۔

طلعت یہ سب خوب جانتی تھی اور فاصلوں کو ماموں سے باتوں ہی باتوں میں گھٹانے کی کوشش بھی کرتی رہتی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ اتنی محبت کرنے والا انسان اپنے خونی ناطوں سے کیسے جدا رہا ہے۔ عثمان ملک کسی سے بھی بات کرتے تو لہجہ کی مٹھاس اور نرمی نمایاں ہوتی۔ جیالوجسٹ تھے، مٹی سے تعلق تھا تو مٹی سے بنے انسان ہی رہتے تھے۔ اکڑ نہ دکھاتے تھے۔ لیکن یہ سب وہاں تھا جہاں ان کا ٹھکانہ تھا۔ دیس سے دور، رشتوں سے دور، اجنبی ماحول، اجنبی لوگ، اجنبی زبان اور اجنبی تصورات بے شک اب اتنے عرصے میں اجنبی نہ رہے تھے لیکن انسان کو ان میں جگہ بنانے کے لئے، ان کے درمیان اپنے آپ کو قبول کروانے کے لئے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ نہیں جھکتا تو وہ دنیا اس کو یکسر مسترد کر دیتی ہے۔ اپنے ماحول اور اپنے لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور نرم دلی زیادہ وزن اس لئے رکھتی ہے کہ انسان کو ایسے کوئی مرحلے درپیش نہیں ہوتے جو اس کے مقام پر اثر انداز ہونے لگیں۔

طلعت علی کو لگتا تھا کہ کوئی بات ہے جو ماموں نے اس سے شیئر نہیں کی، کوئی بھید، کوئی راز، کوئی وجہ جس کی بنا پر وہ ایسے روٹھے روٹھے سے ہو گئے ہیں ورنہ پاکستان کے کتنے ہی فلاحی اداروں کی اعانت خطیر رقوم سے عثمان ملک کرتے ہیں، وہ جان چکی تھی کہ یہ تو اس شخصیت سے مختلف روپ ہے جو اس نے اپنے ذہن میں شعور پاتے ہی اردگرد کے تبصرے سن کر اپنے ماموں عثمان ملک کا بنایا تھا جو ایک ایسا شخص تھا جس کو قدرت کی عطا کردہ کامیابیوں نے مغرور کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ رہ کر پتہ چلا کہ ماموں کا رشتوں سے گریز بے شک تھا لیکن شخصیت میں اچھائی اور خیر کا پہلو خاصا نمایاں تھا۔ اور ا

سکے لئے تو وہ بے حد شفیق ثابت ہو رہے تھے۔ شاید یہ سب اس لئے کہ میری شباہت ان جیسی ہے۔ طلعت علی سوچتی، لیکن اب عرصے سے جب سے ماریو نے دل کے ساز کو چھیڑا تھا سوچوں کا ارتکاز خاصی حد تک وہ ہی تھا۔

اب بھی وہ گھنٹہ بھر سے بستر پر بظاہر آنکھیں بند کئے لیٹی سوئی ہوئی محسوس ہوتی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ ذہن کے پردے میں ماریو کا خیال تتلی کے پروں کی سی لطافت سے پھیلتا آگے بڑھ جاتا۔ وہ اپنے آپ کو بادلوں میں تیرتا ہوا محسوس کرتی جہاں نہ عباس تھا اور نہ کوئی اور رکاوٹ۔ بس من چاہا منظر تھا اور من چاہا ساتھ۔ ایکدم پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ کمرے میں گونجنے لگی اور وہ تصوراتی دنیا سے حقیقت میں آناً فاناً پہنچ گئی۔ ''پھر یہ مصیبت'' طلعت نے باآواز بلند آیت الکرسی کا ورد شروع کرتے دل میں سوچا۔ وہ اس وقت خوفزدہ بھی ہوگئی تھی۔ کچھ دن سے سکون تھا۔ جب سے ماموں نے اس کا کمرہ تبدیل کیا تھا اور پورا ہفتہ اس کے نئے کمرے میں سورۃ بقرہ ختم کی تھی لگتا تھا کہ سب شیطانی قوتیں راستہ بدل چکی ہیں۔ وہ آیت الکرسی پڑھتی جا رہی تھی لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اس کا کمرہ پرندوں سے بھر چکا ہے، ایک انچ جگہ خالی نہیں۔ اسے یاد آیا آج ماریو نے پھر اس سے جرمنی رکنے پر اصرار کیا تھا اور وہ بے اختیار سسک پڑی تھی۔ آنسوؤں کے قطرے اس کی سبزے جیسی آنکھوں سے گرتے سبزے میں جذب ہونے لگے۔ ''نہ روات، تم روتی ہو بہت تکلیف ہوتی ہے۔'' وہ اسے ات ہی کہتا تھا۔ طلعت علی جذباتی کمزوری کے باوجود ماریو سے اگلے ہی لمحے علیحدہ ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اشک اب بھی رواں تھے، ماریو کی ہمدردی نے اس میں مزید تیزی پیدا کر دی تھی لیکن جس طرح وہ ماریو سے جدا ہوئی تھی، ماریو شرمندہ ہو چکا تھا، یہ اس ماحول کا فطری حصہ تھا کہ خوشی، غم، کامیابی، ناکامی میں جنس کی تخصیص کے بغیر گلے لگا لیتے ہیں۔ اب پھر اس نے اپنی دلعزیز ہستی کو بے اختیار تسلی دینا چاہی تھی لیکن وہ جس طرح بدکی تھی، ماریو کو افسوس ہوا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ پھر دونوں کے درمیان مزید کوئی بات چیت نہ ہوئی اور طلعت اٹھ کر اپنے راستہ پر چل دی تھی۔

آیت الکرسی کی تلاوت اس نے جاری رکھی۔ مامی کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ وہ ماموں کو مزید فکرمند نہیں کرنا چاہتی تھی اور ماموں کرتے بھی کیا۔ یہ سب تو اس لئے تھا کہ وہ ماریو کو پسند تھی اور امرتا کو ماریو پسند تھا۔ امرتا نیوکلیئر سائنس کے علاوہ شیطانی سائنس کے داؤ بھی جانتی تھی۔ وہ طلعت کو انتباہ کر چکی تھی کہ اگر اس نے ماریو کا ساتھ نہ چھوڑا تو وہ اسے سکون سے نہیں رہنے دے گی۔ اور جو عجیب واقعات اس کے ساتھ ہو رہے تھے، اسے یقین ہو چکا تھا کہ یہ سب امرتا کے سبب ہیں۔ حالانکہ امرتا کی کسی خفیہ صلاحیتوں کے بارے میں اسے کوئی علم نہ تھا لیکن جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا وہ سب

امرتا کی تنبیہہ کے بعد ہونا شروع ہوا تھا۔ امرتا کی نظروں میں بھی طلعت کے لئے چبھن سی ہوتی تھی۔ وہ اب جب بھی ماریو کے ساتھ ہوتی تو امرتا کال پر طلعت کو یاد دلانا نہیں بھولتی تھی کہ اگر اس نے اپنا راستہ نہ بدلا تو اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔طلعت علی نے اس کی دھمکی کو مذاق نہ جانا تھا لیکن ماریو سے جدائی امرتا کے خوف سے اسے منظور نہ تھی، حالانکہ مذہب کے فرق کی ناقابل عبور خلیج بہرحال اپنی جگہ تھی، جسے وہ تسلیم کرتی تھی۔عباس محمود کے نام کی انگوٹھی بھی ہاتھ میں سجی تھی، یہ بھی حقیقت تھی، کاش کہ ماریو اپنے باپ کے دین کو اپنالے، کاش کہ عباس محمود یہ منگنی خود توڑ دے، کاش کہ ماریو اور میں زندگی کے سفر میں ساتھ چل سکیں.....اور اس تصور کے ساتھ ہی اس کے اردگرد قوسِ قزح کے سے رنگ ابھرنے لگتے، جہاں وہ ہے اور ماریو کی ہنسی سے بنتے بلبلے جن کی شفاعیت پر دھنک چمک رہی ہوتی تھی۔

وہ رات خاصی مشکل تھی۔ طلعت نے کتنی بار کمرے سے باہر بھی نکلنا چاہا، وہ نہ جاسکی، اسے لگتا کہ تیز سوئی جیسی چیز اس کو چبھتی ہے وہ جیسے ہی دروازے کے ہنڈل کو گھماتی ہے۔آواز جیسے حلق میں کہیں گھٹ گئی تھی، سوائے قرآنی دعاؤں کے وہ کچھ کہہ بھی نہیں پا رہی تھی۔ چیخ کر ماموں کو بلانا چاہ رہی تھی لیکن نادیدہ قوت نے اس کو بے بس کر رکھا تھا۔ یہ بے شک تھا کہ پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کے سوا کوئی اور چیز نمایاں ڈرانے والی نہ تھی۔اس نے آیت الکرسی کا ورد جاری رکھا اور جیسے تیسے اندھیرے کا وقت چھٹ گیا اور اس کے کمرے کے آٹو میٹک کلاک سے فجر کی اذان بلند ہوگئی۔ پھر جیسے ہر چیز نارمل ہوتی چلی گئی۔

اس نے لپک کر اپنا موبائل فون اٹھایا اور ماریو کی آواز سنتے ہی سسک پڑی۔''ماریو مجھے تم سے محبت ہے لیکن مجھے اپنے دین سے بھی بہت محبت ہے، میں اس کو تمہاری خاطر کبھی نہیں چھوڑ سکتی، میں.....'' اور پھر طلعت کی آواز آنسوؤں میں پھنس گئی۔

دوسری طرف نیند سے جاگا ماریو پریشانی کے عالم میں اس کو پکار رہا تھا، اَت، اَت! کیا ہوا، ڈیر کچھ تو بولو۔'' لیکن طلعت نے موبائل ہاتھ سے رکھ کر چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ کر رونا شروع کر دیا۔ ماریو کو اس کی آہیں بے چین کر گئی تھیں۔ کال منقطع نہ ہوئی تھی، وہ اضطراری حالت میں طلعت کو پکار رہا تھا لیکن وہ صرف روئے جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر واش روم کی جانب چل دی۔

جب کوئی بظاہر سہارا نہ دکھتا ہو تو اس لمحے رب بہت روشن دکھتا ہے۔محبت نرمی اور رحمت بھرا خالق جو خیر ہی خیر ہے اور سلامتی ہی سلامتی ہے۔فجر کی نماز کا سلام پھیر کر جب اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو دل پھر بھر آیا۔''میرے رب! مجھے حلال کی طرف لے چل اور حرام سے بچالے۔ مجھے محبت کے راستے میں نہ آزما اور میرے لئے خیر کے راستے کھول دے، بے

شک مجھ پر سب بے حد آسان ہے۔'' دعا کے الفاظ کہتے ہوئے آنسو اس کی ہتھیلیوں میں ٹپاٹپ گر رہے تھے۔ وہ کلون چھوڑ کر چلی جائے گی، اس لمحہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ دین کی حدود کو پھلانگ کر محبت کو پانا نہیں چاہتی تھی۔ عباس محمود سے منگنی بھی اس لمحے اسے کوئی مسئلہ نہیں لگ رہی تھی۔ اصل رکاوٹ ماریو کا غیر مسلم ہونا تھا۔ رب کے در پر حاضری نے اس سے فیصلہ کروایا تھا۔ امرتا کی شر انگیزیاں اسے ماریو سے دور نہ کر سکی تھیں، لیکن دین ایمان کی قربانی اسے منظور نہ تھی۔ طلعت نے دل میں ایسا سکون اترتا محسوس کیا جیسے بہت تھکان کے بعد ایک آرام دہ نیند سے ملتا ہے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

۵۔اے ذیلدار پارک کی

چند نا قابل فراموش مجالس

سادہ زندگی گزارنے اور لوگوں کی محبت سمیٹنے والی یہ ہستی پیری اور مریدی کی روایتی گدیوں سے کتنی مختلف تھی!

۱۹۶۷ء میں طیبہ کالج لاہور میں داخلہ لیا، ۱۹۷۱ء میں چار سالہ کورس کی تکمیل کے بعد فارغ ہوا۔ یہ چار سالہ دور اور اس سے وابستہ یادیں زندگی کا سرمایہ ہیں۔ طب کے کورس کے ساتھ ہی میں نے بی اے اور ایم اے کے امتحان دینے کا ارادہ کیا۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے خصوصی رحمت سے نوازا۔ تعلیم کے دونوں میدان میرے لیے عملی زندگی میں بے پناہ مفید اور معاون ثابت ہوئے۔

اتوار کی چھٹی ہوتی اور اس چھٹی سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی۔ عموماً دن کا آغاز سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اس درس حدیث اور قرآن سے ہوتا جو ہر اتوار کو مبارک مسجد قلعہ گوجر سنگھ میں ایک گھنٹے کے پروگرام میں ارشاد فرماتے۔ مولانا وقت پر تشریف لاتے اور پرمغز اور با مقصد گفتگو سے حاضرین کی تشنگی دور فرماتے۔ اُن دنوں محترم چوہدری محمد شفیع (آف ٹانڈہ موٹا) اپنے پروقار چہرے، خوبصورت گول کلے پر پگڑی سرخ و سفید چمکتا چہرہ چمکتی آنکھیں، بھرا ہوا جسم، کمال ادب اور عقیدت سے ایک بڑا دستی پنکھا لے کر مولانا مرحوم کی پشت پر کھڑے ہو کر پنکھے کو ہلاتے رہتے، چوہدری صاحب لاہور کے انتہائی اہم تعلیمی ادارہ سنٹرل ماڈل سکول کے مثالی، علمی و عملی ہیڈ ماسٹر تھے۔ پٹھان کوٹ میں جب ۷۵ افراد کے قافلے نے جماعت کے سفر کا آغاز کیا تو ابتدائی ارکان میں چوہدری محمد شفیع بھی شامل تھے اور دم واپسی تک وفا اور ایثار کا یہ پتلا جماعت میں شامل رہا۔ ایسے وضعدار، بے لوث اور وفا شعار لوگ اب کہاں!

قلعہ گوجر سنگھ کے درس سے فارغ ہو کر بی اے اردو لٹریچر میں شامل غالب کے کلام (ردیف ن، ی) کی غزلوں کے بارے میں رہنمائی لینے کے لیے ایم اے او کالج کے اردو کے استاد پروفیسر نصیر شادانی کی رہائش سوڈی وال میں حاضری دیتا، دینی معاملات میں غالب کے پیروکار تھے۔ بعد ازاں ملتان چلے گئے وہیں دفن ہوئے۔ علامہ اقبالؒ کی طویل نظمیں والدہ مرحومہ کی یاد میں، شکوہ، جواب شکوہ، طلوع اسلام، خضر راہ پڑھنے کے لیے محترم نصر اللہ خان عزیز کے در دولت پر سمن آباد نزد گول چکر حاضری دیتا۔ نصر اللہ خاں عزیز

مصروف ترین زندگی اور بڑھاپے کے باوجود بڑی محبت سے نوازتے اور علامہ اقبالؒ کے آفاقی کلام کا ''درس'' دے کر خوشی محسوس کرتے۔ایک دفعہ اشعار کی تقطیع کے بارے میں عرض کیا تو فرمانے لگے:

شعر، گوئیم از قند و نبات، من نہ دانم فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

ان کے دستخطوں سے اُن کا شعری مجموعہ میری لائبریری کا اہم زیور ہے،ان ہی دنوں بڑے بھائی زین العابدین پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ایم اے عربی کے طالب علم تھے اور ہوسٹل میں قیام پذیر تھے۔اُن کے کلاس فیلو محترم حافظ محمد ادریس تھے، اُن کے کمرہ کے ملحق کمرہ میں محترم عبدالجبار شاکر مرحوم جو کہ ایم اے اردو کے طالب علم تھے،ہ اشعار کی تقطیع اور علامہ اقبالؒ کا شکوہ اور جواب شکوہ انتہائی محبت سے اُنھوں نے پڑھایا۔اہل زبان سے زیادہ شستہ لب ولہجہ اُن کی پہچان تھا۔

ان بزرگوں سے فارغ ہو کر قبل دوپہر حضرت مخدوم علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) کے مزار پر حاضری ہوتی۔وہاں بیٹھ کر قرآن حکیم کی تلاوت ظہر کی نماز تک جاری رہتی،ظہر کی نماز ادا کر کے بادشاہی مسجد کے پہلو میں واقع علامہ اقبالؒ کے مزار پر حاضری ہوتی۔ان دنوں علامہ اقبال کا مرقد فوجی بوٹوں سے ''آزاد'' تھا، اُن کے قدموں کی طرف بیٹھ کر بانگ درا، یا بال جبریل کے اشعار گنگناتا رہتا۔کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔اُن کی مشہور نظم

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہو یارب!

کا ورد کرتا۔اب تو وہاں بیٹھنا یارکنا ہی ممکن نہیں!

نماز عصر بادشاہی مسجد میں ادا کر کے رخ اچھرہ ۵۔اے ذیلدار پارک کا ہوتا۔وہاں مردِ قلندر اقبالؒ کے مردِ مومن اور اپنی صدی کے امام برحق کی مجلس شام تک جاری رہتی۔نماز مغرب مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی امامت میں ادا ہوتی۔

۵۔ذیلدار پارک کی درجنوں مجالس سے لطف اندوز ہونے کا موقع اللہ نے دیا،کوشش یہی ہوتی کہ مولانا کی میز کے قریب ترین جگہ ملے۔پروقار، روشن اور پرنور چہرہ آنکھوں کے سامنے رہے، سادہ لباس، سادہ زندگی مگر وقار اور جلال، لوگوں کے دلوں میں احترام اور محبت سمیٹنے والی یہ ہستی، بلاشبہ ''پیری'' اور ''مریدی'' کی روایتی گدیوں سے مختلف تھی لیکن عقیدت مند انھیں مرشد ہی کے مقام اور روپ میں دیکھتے۔یہ سید کی عظمت تھی کہ ہر خاص و عام کے لیے یہ مجلس صلائے عام تھی۔کوئی آئے اپنے ذہن کی الجھن اور علمی وعملی زندگی کے مسائل کے بارے گفتگو کرے، مولانا محترم محبت وشفقت سے علم کے موتی بکھیرتے۔ پان کھانے والے انسان کے موتیوں کی طرح چمکتے دانت، صاف ستھرا لباس، پھول کی پنکھڑی کی طرح ہونٹ اس ہستی کی نفاست اور معتدل زندگی کے آئینہ دار تھے۔ان مجالس میں چند ایک جن کو بھلا نہ سکا، نذر

قارئین ہیں۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن جن ہنگامہ خیز حالات میں ہو رہے تھے مشرقی پاکستان کی جوصورت حال بن رہی تھی، جماعت اسلامی کا ایک وقار تھا۔ رمضان کے مہینہ میں ہم لوگ مولانا کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک جیپ عقبی دروازہ سے اندر آ کر رکی اس میں چار پانچ مسلح افراد اترے۔ اور دور ہی سے سوال کیا، خوچہ! مودودیؒ کدھر ہے؟ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ احباب سخت غصہ میں ہیں! تاہم لوگوں نے کہا کہ نیچے لان میں کرسی پر بیٹھی شخصیت مولانا مودودی ہیں۔ یہ احباب مجلس میں آئے مگر تیور ابھی درست نہ تھے۔

اُن میں سے ایک نوجوان نے ''السلام علیکم'' کہا۔ مولانا نے چاروں نوجوانوں کو ایک نظر دیکھا اور بڑے دھیمے انداز سے کہا تشریف رکھیں! بیٹھتے ہی ان میں سے ایک نوجوان نے کہا۔ ''مودودی صاحب'' آپ نے قران حکیم کے ترجمہ اور تفہیم القرآن میں وکا ترجمہ ''لیکن''، ''بلکہ'' اور ''کچھ اور'' کیا ہے اور نعوذ باللہ تحریف کی ہے۔ مولانا نے ٹھنڈے دل سے بات سنی اور کہا کہ واللہ کا ترجمہ آپ کیا کریں گے، والتین وزیتون کا ترجمہ کیا ہوگا، والنجم والثاقب کا ترجمہ کیا ہو گا؟ مولانا نے پانچ چھ آیات تلاوت کیں اور کہا ''بیٹا اس کا ترجمہ کیا ہوگا؟'' وہ صاحب سن کر خاموش ہو گئے۔ مولانا نے فرمایا کیا آپ نے تفہیم القرآن کا مقدمہ پڑھا ہے؟ میں نے خود واضح کیا ہے کہ میں لفظی ترجمہ نہیں کر رہا۔ لفظی ترجمہ مجھ سے پہلے بہت فاضل لوگ کر چکے ہیں۔ میں نے تو اردو میں ترجمانی کی کوشش کی ہے۔ ان صاحب نے کہا کہ میں نے مقدمہ تفہیم القرآن نہیں دیکھا۔

پھر ان میں سے ایک نوجوان نے پوچھا کہ مولانا! آپ کی داڑھی مصنوعی ہے؟ مولانا مسکرائے اور فرمایا بیٹا میں آپ کے سامنے اپنی داڑھی کے ساتھ موجود ہوں! تیسرے صاحب نے سوال کیا آپ پان کھاتے ہیں آپ کا پاندان کدھر ہے؟ مولانا کا پاندان عموماً میز پر رکھا ہوتا تھا، مولانا نے فرمایا! بیٹا! یہ میرا پاندان ہے، اس شخص نے ہاتھ سے اٹھایا دیکھا اور رکھ دیا! چوتھے نے سوال کیا! مولانا آپ روزہ رکھتے ہیں؟ سوال بڑا عجیب تھا، مولانا، اس وقت بھی روزہ سے تھے مجلس میں بیٹھے ہم جیسے مداح پریشان تھے کہ معاً ان میں سے ایک نوجوان نے جیب سے ایک پمفلٹ نکالا جو کہ ہزارہ کے علاقہ میں تقسیم کیا گیا تھا اور یہ پمفلٹ نامور عالم دین مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب کی طرف سے شائع کردہ تھا۔ اس پمفلٹ میں درج تھا کہ مولانا نے قرآن کا ترجمہ اپنی مرضی سے کیا ہے، مولانا کی داڑھی مصنوعی ہے جو کہ مجلس میں بیٹھتے وقت لگا لیتے ہیں، مولانا کا پاندان سونے کا ہے، پان میں چاندی اور سونے کا کشتہ کھاتے ہیں، اور نعوذ باللہ روزہ نہیں رکھتے۔ مولانا نے یہ پمفلٹ ایک نظر دیکھا اور فرمایا ''میں مولانا ہزاروی کا شکر گزار ہوں جو ان

علاقوں میں میرا تعارف کرا رہے ہیں جہاں میں جا نہیں سکتا۔ وہ میری نیکیوں میں اضافہ کر رہے ہیں اللہ کے دربار میں ان کے نیک کام میرے کھاتہ میں ہوں گے۔''

اس پمفلٹ کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ آنے والے نوجوانوں کے جذبات کیوں ایسے جارحانہ تھے! اس منظر کو دیکھ کر موجود حضرات نے کہا، مولانا اس پمفلٹ کا جواب ضرور شائع کروائیں، مولانا مسکرائے اور کہا کہ میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، مولانا ہزاروی اپنا کام انجام دے رہے ہیں، میں اپنی ذمہ داری پوری کر رہا ہوں، میں اپنا وقت تعمیری کاموں میں صرف کر رہا ہوں، مولانا نے اپنے ملازم کو بلایا اور فرمایا افطار کا وقت ہو رہا ہے یہ مہمان بڑی دور سے آئے ہیں، اُن کی افطاری کا بندوبست کیا جائے۔ غصہ میں بپھرے یہ نوجوان مولانا کے رویہ سے عملاً ڈھیر ہو گئے۔

''ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سے کہیں جسے!''

الیکشن کے بعد بڑی مایوسی کی کیفیت تھی، مولانا سے ملنے کے لیے شورش کاشمیری تشریف لائے اور اس برآمدے میں بیٹھے جس میں مولانا بیٹھ کر تحریر کا کام کرتے تھے۔ مولانا کی چند منٹ کی گفتگو کہ ہمارا کام اندھیروں میں چراغ جلانا ہے شورش جیسے انسان کے لیے کمال طمانیت کا سامان کر گئی۔ بعد ازاں مولانا کی یہی گفتگو ہفت روزہ چٹان کے صفحہ اول پر مولانا کے خط کی صورت میں شائع ہوئی۔

جب ایوب خان کے خلاف تحریک نقطہ عروج پر تھی اور DAC معرض وجود میں آ رہی تھی جنرل اعظم مولانا کے ہاں تشریف لائے، لوگ جنرل صاحب کے ۱۹۵۳ء کے فوجی عدالت کے فیصلے کے تناظر میں دیکھتے تھے مگر مولانا جس اخلاق حسنہ پر فائز تھے، جنرل صاحب کو عزت واحترام سے نوازا۔

ایک دفعہ میں نے مولانا سے چند سوال کیے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ ہم ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کو شمس العلماء کہتے ہیں اور قرآن پاک کے کچھ حصہ کا ترجمہ وتفسیر کرنے کی بنیاد پر انھیں رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، جبکہ وہ سود کھاتے تھے۔ کیا انھیں رحمۃ اللہ علیہ کہنا درست ہے؟ مولانا نے جواباً فرمایا کہ رحمۃ اللہ علیہ کے معنی کیا ہیں؟ میں کیا جواب دیتا! فرمانے لگے اگر یہ جملہ نہ کہیں گے تو اُن پر کیا اثر ہو گا؟ اگر کہیں گے تو کیا درجہ بلند ہو گا؟ یہ تو دعائیہ جملہ ہے، فرمانے لگے میں نے کہیں نہیں پڑھا کہ وہ سود لیتے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ جو کہ مولانا نذیر احمد دہلوی کے شاگرد خاص تھے۔ اُنھوں نے ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ اُن کی زبانی میں تذکرہ کیا ہے۔'' مولانا نے فرمایا کہ میں نے نہیں پڑھا، البتہ آپ رحمۃ اللہ نہیں کہنا چاہتے نہ کہیں۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ مولانا آپ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپ داتا گنج بخش کے دربار پر حاضری نہیں دیتے اور قائداعظم جو کہ پاکستان کے بانی ہیں کے مزار

پر بھی کبھی نہیں گئے۔ مولانا مسکرائے اور پوچھا کہ جانتے ہو ''داتا'' کے معنی کیا ہیں اور داتا کون ہے؟ کیا مخدوم علی ہجویری خوبصورت نام نہیں؟ پھر فرمایا کہ کیا مجھ جیسا انسان مخدوم علی ہجویری کے روضہ پر نہیں گیا تو اُن کے بلند مرتبہ اور اُن کی خدماتِ جلیلہ میں کوئی کمی ہوئی ہے؟ کیا آپ یہاں یا دنیا کے کسی حصہ میں بیٹھ کر دعا کریں تو قبول نہیں ہوتی؟'' قائداعظم کا جو مقام ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے، میری حاضری یا غیر حاضری سے اُن کے مقام پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں بزرگوں کے لیے میں ہمیشہ دعا کرتا ہوں۔ مولانا کے سمجھانے کا انداز شاید ہی کسی اور کو حاصل ہو۔

۵۔ اے ذیلدار پارک کی ان مجالس میں ایک نوجوان جو پی ایچ ڈی زوالوجی کر رہا تھا، وہ حاضر ہوا۔ بڑے مدلل انداز سے کہا مولانا آپ ڈارون کے نظریہ ارتقا کو رد کرتے ہیں، حالانکہ سائنسی اعتبار سے وہ درست ہے۔ مولانا نے فرمایا کیا آپ نے تفہیم القرآن میں انسانی تخلیق کے بارے میں سائنسی تحقیقات پر میری رائے کا مطالعہ کیا ہے؟ اس نوجوان نے انکار کیا، مولانا نے اس نوجوان کو تلقین کی کہ یہ مطالعہ کریں، انسان اپنی نوع کے اعتبار سے تخلیق سے لے کر آج تک اسی نوع میں ہے! تاہم وہ نوجوان اگلی اتوار دوبارہ آیا تو اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا، مولانا نے انسانی تخلیق کے بارے کسی نئی شائع شدہ کتاب کے بارے میں سوال کیا۔ اس نوجوان نے کہا مولانا! یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری! مولانا نے اپنے ملازم کو بلایا جو ہر وقت موجود ہوتا، اور چوہدری صفدر صاحب (اللہ انھیں زندگی دے) جو وہاں موجود ہوتے، ان سے کہا کہ اسے کہیں میرے کمرہ میں دائیں طرف فلاں الماری کے اوپر والے فلاں خانے میں دائیں طرف سے فلاں نمبر کی کتاب لے لائے۔ کچھ دیر میں وہ کتاب آ گئی۔ مولانا نے اس نوجوان کو کتاب دی اور کہا کہ آپ تعلیم یافتہ ہیں، میں آپ پر اعتماد کر رہا ہوں۔ یہ پورے پاکستان میں کراچی کی ایک لائبریری کے بعد دوسری کتاب ہے۔ آپ اس کے فلاں صفحہ سے لے کر فلاں تک مطالعہ کریں۔ اگلی اتوار وہ نوجوان یہ امانت لے کر حاضر ہوا۔ مگر اب اس کا لب ولہجہ اور انداز وہ نہیں تھا، مولانا کے علمی مقام اور اُن کے وسیع مطالعہ، حافظہ اور مطالعہ پر گرفت کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ ڈارون کی تھیوری کا مداح مولانا کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اُن سے کہا میں نے آپ کو ایک عام مولوی کی حیثیت سے Deal کیا تھا، مگر اس کے بغیر چارہ نہیں کہ میں تسلیم کروں واقعی دیگر علما کے مقابلہ میں جو علمی مقام آپ کو حاصل ہے، آپ ہی اس کے حقدار ہیں۔

۱۹۷۷ء میں جب مولانا علاج کی غرض سے امریکہ جا رہے تھے تو ہم چند دوست حکیم زبیر حمید کوئٹہ، حکیم سید اقرار حسین بخاری پاک پتن شریف اور راقم الحروف مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے مصروفیت کے باوجود وقت دیا، محبت سے پیش

آئے، ہماری خواہش تھی کہ جماعت کی برادر تنظیموں کی طرح اطباء کی ایک تنظیم جمات کے ارکان پر مشتمل اطباء کی تشکیل دی جائے۔ مولانا نے اس تجویز کو سراہا اور محترم حافظ محمد ادریس صاحب سے رابطہ کر کے تنظیم سازی کی طرف توجہ دلائی، ان دنوں طبی بورڈ کی تشکیل نو ہو رہی تھی۔ پوچھا کہ کیا نیر واسطی اس کے رکن نامزد ہوئے ہیں، ہم نے عرض کیا کہ نہیں، فرمانے لگے کیسا طبی بورڈ ہے جس میں حکیم نیر واسطی جیسی شخصیت شامل نہیں۔ اسی نشست میں ہم نے پوچھا مولانا سیرت کے موضوع پر آپ کی کتاب کی دو جلدیں تو شائع ہو چکی ہیں، باقی دو کی نوید تھی، وہ کب شائع ہوں گی؟

مولانا نے فرمایا کہ میں نے کام مکمل کر کے ملک غلام علی صاحب کے سپرد کر دیا ہے، ان شاء اللہ وہ بھی شائع ہوں گی تاہم آج تک یہ خبر نہ ملی کہ دو جلدوں کا یہ مسودہ کہاں گیا!

۵۔ اے ذیلدار پارک کی ان مجالس کے علاوہ مولانا مرحوم کو زندگی میں صرف ایک مرتبہ کھڑے ہو کر تقریر کرتے دیکھا۔ یہ گوجرانوالہ کا انتخابی جلسہ ۱۹۷۱ء تھا جہاں چوہدری محمد اسلم نے جماعت کی طرف سے ۵ لاکھ کی تھیلی الیکشن فنڈ مولانا کو پیش کیا۔

مولانا مرحوم کو اس دن بہت ہی زیادہ خوش وخرم دیکھا جب فلیٹیز ہوٹل میں تکمیل تفہیم القرآن کی تقریب ہوئی جس میں ممتاز قانون دان اے کے بروہی نے انتہائی مختصر مگر انتہائی جامع تقریر کی۔

مولانا مرحوم کو زندگی میں ایک ہی بار مغموم دیکھا جب المیہ مشرقی پاکستان کے وقت ڈھاکہ میں بھارتی فوجیں داخل ہوئیں اور پاکستانی فوج نے ذلت آمیز تقریب میں پلٹن میدان میں ہتھیار ڈالے۔

ان مجالس کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے جہاں یہ شمع لوگوں کو چراغِ راہ کی حیثیت سے روشنی عطا کرتی تھی! بلاشبہ مولانا کی تعلیمات نے ہزاروں نوجوانوں کو گمراہی سے بچا کر صراطِ مستقیم پر چلنے پہ آمادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدماتِ جلیلہ کو قبول فرماتے ہوئے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین

❁❁❁

ملکہ رضیہ سلطانہ

رضیہ سلطانہ ہندوستان کی پہلی اور آخری مسلمان خاتون ہے جو دلی کے تخت پر بیٹھی۔ اسے رضیہ سلطان بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا دورِ حکومت ۶۳۴ھ سے ۶۳۷ھ تک رہا۔ وہ خاندان غلاماں کے تیسرے فرمانروا سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی اور اسی خاندان کے پہلے سلطان قطب الدین ایبک کی نواسی تھی۔

رضیہ سلطانہ بچپن سے ہی بڑی ذہین وفطین تھی۔ التمش جو علم دوست حکمران کے طور پر پہچانا جاتا ہے اس نے اپنی بیٹی کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی۔ رضیہ نے ابتدا میں قرآن پاک پڑھا پھر بڑے بڑے علماء سے مروجہ علوم کی تعلیم پائی اس کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ فنونِ حرب وضرب بھی سیکھے اور شہسواری، شمشیرزنی اور نشانہ بازی میں بھی طاق ہوگئی۔ اس کے اعلیٰ اوصاف کی وجہ سے التمش اس کو بے حد عزیز جانتا تھا۔ اسے کاروبارِ حکومت چلانے کے گُر بھی سکھاتا رہتا اور حکومتی امور میں اس سے مشورے بھی لیتا۔ اگر حکومتی امور کے سلسلے میں اسے دارالحکومت سے باہر بھی جانا پڑتا تو رضیہ کو اپنا جانشین بنا کر جاتا۔ حالانکہ اس کے بیٹے بھی موجود تھے مگر وہ بیٹوں کی بجائے بیٹی پر زیادہ اعتماد کرتا۔ اس کی عدم موجودگی میں رضیہ نہایت خوش اسلوبی سے امورِ مملکت انجام دیتی۔ یوں التمش کے زمانے سے ہی رضیہ سلطانہ کو سلطنت کے امور سے واقفیت ہوگئی تھی۔ حکومت کے بہت سے پیچیدہ مسائل میں اس کی رائے حرفِ آخر کا درجہ رکھتی۔ التمش کو اس کی فہم وفراست پر بے حد اعتماد تھا۔ گوالیار کی فتح کے بعد التمش نے اپنے چند خاص امراء کی موجودگی میں رضیہ سلطانہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ ان امراء نے اس موقع پر التمش سے سوال کیا کہ ''آخر بیٹوں کے ہوتے ہوئے ایک بیٹی کو وارث تاج وتخت قرار دینے میں کیا حکمت ہے؟'' التمش نے جواب دیا کہ ''میں بیٹوں کی عادات واطوار اور چال چلن سے اچھی طرح واقف ہوں اس وقت جبکہ وہ ہر لحاظ سے میرے دستِ نگر ہیں بری طرح میخواری اور عیش وعشرت میں مشغول ہیں اس وجہ سے میں انہیں حکمرانی کے قابل نہیں سمجھتا۔ رضیہ سلطانہ کو میں اپنے بیٹوں پر اس لئے ترجیح دیتا ہوں اگرچہ بظاہر وہ ایک عورت ہے لیکن عقل وپختگی کے لحاظ سے حقیقتاً مرد ہے۔''

رضیہ سلطانہ بلاشبہ بہادر اور جری خاتون تھی وہ مردانہ لباس میں تمام ہتھیار لگا کر گھوڑے پر سوار ہوکر باہر نکلتی تھی۔ ہندوستان کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ

جب وہ شکار کو جاتے تو اپنے ساتھ حرم کی خواتین کو بھی لے جاتے۔ ایک مرتبہ التمش شیر کے شکار کو گیا خواتین پیچھے تھیں کہ ایک شیر جنگل سے نکل کر بادشاہ پر جھپٹا عین اس وقت رضیہ برق رفتاری سے وہاں پہنچی اور تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ شیر وہیں پر ڈھیر ہوگیا، اگر وہ نہ پہنچ گئی ہوتی تو بادشاہ بری طرح زخمی ہوگیا ہوتا۔ اس واقعے کے بعد التمش کی نظر میں رضیہ کی وقعت بڑھ گئی۔

التمش کے آٹھ بیٹے تھے ایک بیٹا اس کی زندگی میں ہی انتقال کر گیا۔ باقی سات پر قابلیت اور حسن سیرت کے اعتبار سے وہ رضیہ کو ہی ترجیح دیتا ایک روایت ہے کہ اس نے وفات سے پہلے رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس نے بستر مرگ پر اپنے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کو تاج وتخت سونپ دیا۔ لیکن اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ اس کے بعد رضیہ سلطانہ تخت پر بیٹھے۔ التمش کی وفات کے بعد امرائے دربار نے عورت کی حکمرانی کو ناپسند کرتے ہوئے رکن الدین فیروز شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ پرلے درجے کا عیاس اور اوباش نوجوان تھا ہر وقت نشے میں دھت رہتا۔ سلطنت کا انتظام اس کی ماں شاہ ترکان چلاتی تھی وہ بڑی سنگدل عورت تھی وہ ایک ترکی لونڈی تھی جس نے التمش کے حرم میں داخل ہو کر التمش پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ یہ عورت نہایت کینہ پرور تھی اس نے اپنے بیٹے رکن الدین کی عیش کوشی سے بہت فائدہ اٹھایا اور التمش کی بہت سی بے نکاحی بیویوں کو بڑی ذلت اور رسوائی کے ساتھ قتل کر ڈالا اور التمش کے حرم کی ترکی خواتین بھی اس عورت کی آتش حسد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ترکان شاہ کے ظلم وستم سے تنگ آ کر یہ معزز خواتین مفلسی اور غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئیں۔ اس نے التمش کی اولاد پر بھی بہت ظلم ڈھائے التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا قطب الدین شاہ ترکان کے اشارے سے قتل کیا گیا۔ شاہ ترکان کے ان مظالم کی وجہ سے دلی کا ہر چھوٹا بڑا شخص رکن الدین کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

آخر کار ۶۳۴ھ میں دلی کے عوام اور فوج کے ایک حصہ کی جانب سے رکن الدین فیروز کو معزول کر کے رضیہ کے ملکہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

وہ رضیہ سلطان کا لقب اختیار کر کے بڑی شان وشوکت سے تخت شاہی پر متمکن ہوئی۔ حکمرانی کے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے اس نے پردہ ترک کر دیا اور مردانہ لباس زیب تن کر کے دربار عام منعقد کیا۔ التمش کے عہد کے تمام ضابطے قوانین جو طاقِ نسیاں ہوگئے تھے انہیں دوبارہ نافذ کیا۔ عوام الناس سے وعدہ کیا کہ ان کی فلاح وبہبود کیلئے جو کچھ بھی اس کے بس میں ہے کرے گی۔

رضیہ سلطانہ کے اوصاف حمیدہ کے باوجود وزیر سلطنت نظام الملک محمد جنیدی، علاؤالدین شیر خانی، ملک سیف الدین کوچی، ملک اعزالدین کبیر خانی نے اس کو ملکہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف بغاوت کی تیاری شروع کر دی، ملکہ نے نہایت حکمت

عملی سے ان میں پھوٹ ڈلوا دی اور ان کو ایسا زچ کیا کہ وہ ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرے۔

رضیہ سلطانہ کا دورِ حکومت نہایت عادلانہ تھا۔ وہ امیر غریب، مسلم غیر مسلم، ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتی تھی۔ مظلوموں کی فریاد سنتی، ظالموں کو سزا دیتی، شاہی ملازمین میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ رشوت لے۔ وہ ہاتھی پر بھی سوار ہوتی لیکن گھوڑے پر سواری اسے بہت پسند تھی، جنگ کے وقت فوج کو خود مرتب کرتی اور اپنے سپاہیوں کے دوش بدوش دادِ شجاعت دیتی۔ اس نے قاضی کبیر الدین، قاضی نصیرالدین، قاضی سعیدالدین اور قاضی جلال الدین پر مشتمل ایک مجلس قضا قائم کی جس کے مشورے سے جملہ احکام صادر کیے جاتے تھے۔

رضیہ سلطانہ نے نظام سلطنت کو چلانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا لیکن اس کو امن وچین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا کیونکہ بہت سے امراء اسکے خلاف سازشوں میں مصروف رہے، اس کی وجوہ یہ تھیں کہ وہ عورت کی حکمرانی کو اپنے لئے باعثِ توہین سمجھتے تھے۔ اس کے مردانہ لباس اور بے نقاب آنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ تیسری وجہ ملکہ کا ایک حبشی غلام ملک جمال الدین یاقوت تھا جو شاہی اصطبل کا مہتمم تھا اسے ترقی دے کر ملکہ نے میر شکار کے عہدے پر فائز کر دیا تھا اور اسے امیر الامراء کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس عنایت خسروانہ کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک لڑائی میں اس نے ملکہ کی جان بچائی تھی وہ قابل اور باصلاحیت آدمی تھا اسی لئے ملکہ نے اسے ترقی کا اہل سمجھا لیکن ترک امراء نے اس کو غلط معنی پہنائے اور اس کی ترقی کو انہوں نے اپنے لئے توہین سمجھا اور ملکہ پر تہمت طرازی کی۔ یوں ملکہ کے اقبال کا ستارہ تاریکی کے دامن میں آ گیا۔

لاہور کے حاکم اعزالدین نے علم سرکشی بلند کیا۔ ملکہ خود لشکر تیار کر کے اس کے مقابلے کیلئے روانہ ہوئی حاکم لاہور کو مقابلے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے بغیر مقابلے کے اطاعت قبول کر لی۔ رضیہ کو اعزالدین کا یہ اندازِ اطاعت بہت پسند آیا اس نے خوش ہو کر لاہور کی حکومت کے ساتھ ملتان کی حکومت بھی اعزالدین کو سونپ دی۔ بٹھنڈہ کا حاکم ملک التونیہ جو ''ترکان چہل گانی'' میں سے تھا (ترکان چہل گانی التمش کے چالیس غلام تھے جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے) اس نے یاقوت حبشی کے اثر واقتدار سے تنگ آ کر رضیہ کے خلاف بغاوت کر دی اس کے جواب میں رضیہ نے اپنی فوج کو تیار کیا اور بٹھنڈہ پر حملہ کر دیا۔ شاہی فوج ابھی راستے میں ہی تھی کہ ترکی امراء نے اس پر چھاپہ مارا اور اس معرکے میں ترکوں کو فتح ہوئی یاقوت حبشی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور رضیہ سلطانہ کو قید کر کے بٹھنڈہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔

ملکہ کی نظر بندی کے بعد ان باغی امراء نے ملکہ کے بھائی اور سلطان التمش کے بیٹے معزالدین بہرام شاہ کو تخت نشین کر دیا۔

اسی دوران بٹھنڈہ کے حاکم ملک التونیہ نے رضیہ سلطانہ سے شادی کر لی۔ رضیہ اور التونیہ نے آپس کے صلاح مشورے کے بعد کھکروں، جاٹوں، آس پاس کے دیگر زمینداروں کے لڑاکے قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک زبردست لشکر تیار کیا اور دلی پر حملہ کر دیا۔ معزالدین بہرام شاہ نے بھی اپنی فوج اعزالدین بلبن کی ماتحتی میں روانہ کی۔ اعزالدین بلبن التمش کا داماد تھا جو بعد میں الغ خان کے لقب سے مشہور ہوا۔ راستے میں ہی دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ ایک زبردست جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں رضیہ سلطانہ کو شکست ہوئی وہ میدان جنگ سے بھاگ کر بٹھنڈہ میں پناہ گزیں ہوئی۔

رضیہ اس شکست کے بعد آرزدہ خاطر نہ ہوئی، اس کی بے چین اور اقتدار پسند طبیعت نے اسے آرام سے نہ بیٹھنے دیا اور اپنے منتشر لشکر کو از سرِ نو مرتب کر کے ایک بار پھر دلی پر حملہ آور ہوئی اس بار بھی بہرام شاہ نے اعزالدین کو رضیہ کے مقابلے پر روانہ کیا۔ کیتھل کے گردوپیش کے علاقے میں دونوں لشکروں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ اس بار بھی رضیہ کو شکست ہوئی اور اعزالدین کامیاب رہا۔ رضیہ اور التونیہ دونوں میدان جنگ سے بھاگ نکلے لیکن چند زمینداروں نے انہیں گرفتار کر لیا۔

رضیہ کی موت کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان زمینداروں نے انہیں گرفتار کر کے معزالدین بہرام شاہ کے سامنے لایا گیا اور اس کے حکم سے ۲۷ رمضان المبارک ۶۴۰ھ کو دونوں کو قتل کر کے وہیں دفن کر دیا گیا بعد میں رضیہ سلطان کے چھوٹے بھائی سلطان ناصرالدین محمود نے دونوں کی قبروں پر ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کرایا۔ جو آج بھی کیتھل (ضلع کرنال مشرقی پنجاب بھارت) میں کھنڈر کی صورت میں موجود ہے۔ اس سے ملحق ایک مسجد کے کچھ آثار باقی ہیں۔

دوسری راویت یہ ہے کہ اس جنگ میں ملک التونیہ کو قتل کر دیا گیا لیکن رضیہ جان بچا کر ایک جنگل میں چھپ گئی جب بھوک پیاس نے تنگ کیا تو ایک دہقان سے کھانے کو کچھ مانگا۔ تھوڑی سی روٹی کھا کر وہ ایک درخت کے سائے میں لیٹ کر سو گئی۔ وہ اس وقت مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی لیکن نیند کی حالت میں کپڑے ادھر ادھر کھسکے تو دہقان کو معلوم ہو گیا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ اس نے زیوروں کے لالچ میں اسے سوتے ہوئے قتل کر دیا اور وہیں دفن کر دیا جب وہ زیورات فروخت کرنے شہر گیا تو پکڑا گیا۔ پوچھ گچھ پر اس نے سارا واقعہ بتایا۔ چنانچہ ملکہ کی نعش کو وہاں سے نکال کر دلی کے قریب دریائے جمنا کے کنارے دفن کیا گیا۔ یہ قبر اب بھی موجود ہے اور لوگ اسے ''امی کی درگاہ'' کہتے ہیں۔

رضیہ سلطانہ کا دورِ حکومت صرف تین سال اور تین ماہ پر محیط ہے اس کا بیشتر حصہ انتشار کی حالت میں گزرا پھر بھی اس کے دورِ حکومت کے کئی خوش گوار واقعات

تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اسے ذہانت اور خوبصورتی باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی، وہ بڑی با تدبیر، زیرک، بہادر، انصاف پسند، خوش اخلاق اور علم دوست خاتون تھی۔ حنفی المسلک اور علماء صوفیہ کی بڑی عقیدت منداور قدر دان تھی۔ اس نے متعدد مدرسے قائم کیے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے خلفاء کی تبلیغ اسلام میں اعانت کی۔ اس نے مہرولی میں اپنے والد کا شاندار مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔

طبقاتِ ناصری کے مصنف مولانا منہاج سراج نے اس کو عالم نواز یعنی علماء وفضلا کی قدر دان کا خطاب دیا ہے۔

ملکہ رضیہ سلطان کو شعر وسخن کا بھی عمدہ ذوق تھا وہ فارسی کی نغز گو شاعرہ تھی اور شریں تخلص کرتی تھی۔

(استفادہ: تاریخِ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ، تاریخ اسلام کی چار سو با کمال خواتین از طالب ہاشمی، سفرنامہ ابنِ بطوطہ)

☆☆☆

تجھ سا لاؤں کہاں سے ؟

وہ جس نے میری گواہی دینے کا وعدہ کیا تھا وہ مجھ سے پہلے چلی گئی.....ایک سہیلی کا تذکرہ

ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ پاکستان آنا ہوا تو لاہور میں فرزانہ چیمہ کے ساتھ منصورہ میں ملاقاتوں کے لئے کئی گھروں میں گئے۔ خالہ جان میمونہ نثار (اللہ ان کو سلامت رکھے) کے ہاں گئے تو انہوں نے کہا

''بشریٰ! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو تم نے میرے بارے میں اپنی یادداشتیں لکھنی ہیں۔'' وہ اپنی بہن (میری والدہ) کے بارے میں میری تحریر سے بہت متاثر تھیں۔

میں نے پوچھا ''اگر میں پہلے رخصت ہوگئی تو مجھے کون یاد کرے گا اور میرے بارے میں کچھ لکھے گا؟''

فرزانہ چیمہ نے ہنستے ہوئے پھلجھڑی چھوڑ دی۔''بشریٰ! تسی مروتے سہی، لکھن والے بہت نے''

(بشریٰ! آپ مریں تو سہی لکھنے والے بہت ہیں) اللہ تعالیٰ فرزانہ چیمہ کو زندگی وصحت عطا فرمائیں تا کہ وہ اپنا وعدہ وفا کر سکیں۔ ہم تینوں نے فرزانہ کی بات سے خوب لطف اٹھایا۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا مگر میں سوچتی رہی بعد میں، کہ فرزانہ چیمہ کے علاوہ اور کون ہوگا؟ یہ خود کو ہی ''بہت'' شمار کرتی ہوں گی۔ معاً مجھے ایک اور فرزانہ کا خیال آیا کہ محبت وتعلق میں اس فرزانہ کا بھی کوئی جواب نہیں۔ وہ ضرور مجھے یاد کرے گی۔ مگر دل بے حد رنجور ہے کہ فرزانہ کی محبت کی یادیں ہی رہ گئیں ہیں ''فرزانہ خالد'' مخلص، بے لوث ایثار کرنے اور ہر کسی کے کام آنے والی، ہر فن مولا اور مکمل احساس ذمہ داری کے ساتھ ڈیوٹی ادا کرنے والی، خوش مزاج، ساتھی تھی۔

ہم لاہور سے ملتان شفٹ ہوئے تو معلوم ہوا کہ ہمارے گھر کے قریب ہی خالد صاحب معروف کالم نگار، مزاحیہ شاعر کا گھر ہے۔ جن سے میرے بہنوئی کی بہت گہری دوستی ہے۔ اس دن خالد صاحب کے گھر کی گلی کسی وجہ سے بند تھی تو وہ اپنی گاڑی ہمارے گھر کے گیراج میں کھڑی کرنے آئے تو ان کی بیگم سے ملاقات ہوئی، حسبِ روایت انہوں نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ چند منٹ کی اس پہلی ملاقات میں انہوں نے اپنی بے تکلفی، خوش مزاجی کی پہچان کرادی تھی۔ جو ہر ملاقات پر اپنے اثرات کی تاثیر بڑھا دیتی تھی۔ دو چار ملاقاتوں میں ہمارے درمیان گہری دوستی ہو چکی تھی۔

میں نے فرزانہ خالد کو ہمیشہ لگن سے کام کرتے دیکھا۔ معمولی کام ہوتا یا کوئی بڑا کام پوری تندہی سے کرنا اس کا طریقہ تھا۔ ہمارے گھر فون نہیں لگا تھا اور نہ ہی لگوانے کا ارادہ تھا کیونکہ کرائے کا گھر تھا اور اپنے گھر میں شفٹ ہونے میں کوئی زیادہ دیر نہ تھی۔ فون کرنے کے لئے ہمیشہ فرزانہ کے گھر جانا پڑتا۔ کبھی بے وقت بھی جا کر پریشان کرنا پڑتا۔ ''حریم ادب'' کی ذمہ داری اور ان دنوں مجلّہ حریم کی تیاری کے سلسلہ میں اکثر فون کرنے پڑتے۔ فرزانہ کے ماتھے پہ کبھی بل نہ آئے۔ ہمیشہ خوش ہوتی اور خاطر تواضع علیحدہ کرتی۔ اکثر ہمارے درمیان کھانے پینے کی چیزوں کا بھی تبادلہ ہوتا رہتا۔

فرزانہ کی بہت سی اچھی عادتوں میں سے ایک اچھی عادت یہ تھی کہ اگر اس کو مشورہ دیا جاتا۔ کسی کام کی طرف توجہ دلائی جاتی۔ تو بحث برائے بحث نہ کرتی۔ اس پر غور ضرور کرتی اور اکثر ہی مان بھی جاتی۔

دراصل اس میں سیکھنے کا جذبہ تھا۔ تواضع تھی۔ اپنی غلطی مان لینے کا ہنر آتا تھا۔ اور دوسرے کا مان رکھ لیتی تھی۔

''دیکھو، میرا دھیان ہی نہ گیا اس طرف'' کہہ کر تسلیم لیتی تھی۔

چند ہفتوں کے بعد ہمارے درمیان اتنی اچھی دوستی ہوگئی کہ دن میں دو چکر اگر میں نے اس کے گھر کے لگائے تو دو وہ بھی لگا لیتی تھی۔ ایک دن میں ملنے گئی تو سیڑھی پر کھڑی دیوار پر وائٹ واش کر رہی تھی۔ کبھی دروازے کھڑکیاں روغن کر رہی ہے، رات بھر میں کشن وغیرہ کو پینٹ کر لیا یا کڑھائی کر لیا جو ایک بار تبدیل کرنے کا دماغ میں خیال آیا تو وہ کر کے ہی دم لینا ہے۔ ہاں تو اس دن اس کو سیڑھی پہ کھڑے بازو، کپڑے سب سفیدی سے بھرے ہوئے دیکھا تو وہ بات کہے بغیر نہ رہ سکی جو بہت دنوں سے اسے کہنا چاہ رہی تھی۔

فرزانہ مجھے دیکھ کر سیڑھی سے نیچے اتری اور حسب معمول اپنی جان دار سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

''خالد، باہر گئے ہیں کچھ دنوں کے لئے، میں نے سوچا گھر میں کوئی تبدیلی لائی جائے کہ وہ آ کر خوش ہو جائیں۔''

میں نے کہا ''اتنی قابل، ذہین، محنتی خاتون کن کاموں میں خرچ ہو رہی ہے۔''

دو چار باتوں کے بعد ہی وہ مان گئی کہ یہ کام وہ نہیں جو اس کو زیب دیتے ہیں۔ یہ سب تو پروفیشنل سے کرائے جا سکتے ہیں۔ وہ اس سے بہتر کام کرنے کے قابل ہے۔ اور اس کو بہتر کام کی طرف راغب کر کے اور اس کے بارے میں سوچنے کا کہہ کر میں گھر آ گئی۔ اگلے دن صبح سویرے فرزانہ آ گئی۔

''بشریٰ! میں آج سے اپنے گھر میں ہفتہ وار قرآن پاک کی کلاس رکھ رہی ہوں آپ نے ہی درس

دینا ہے۔شام کو عصر کے بعد آ جانا۔''

میں نے یہی دیکھا کہ وہ کام کا سوچ لیا تو پھر اس پہ عمل کرنے میں دیر نہ لگاتی تھی۔

ایسی ہی صلاحیت وقابلیت کی بنا پر گزشتہ سے پیوستہ الیکشن میں خواتین کی مخصوص نشستوں کے لئے اس کو نامزد کیا گیا جس کی وہ حقدار بھی تھی۔

وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، سمجھدار، جہاں دیدہ خاتون تھی مگر دوسروں سے سیکھنے کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے کندھوں پر آتا گیا۔اور ہر کام کو اس نے خوش اسلوبی سے کیا۔مجھ سے عمر میں چھوٹی تھی،لیکن آہستہ آہستہ وہ مجھے آپ سے تم کہنے میں زیادہ سہولت محسوس کرنے لگی۔

دوستی کو جب دینی وتحریکی رشتے کا تڑکا لگ جاتا ہے تو اس کا مزہ دوبالا ہوجاتا ہے۔ بہت کم دوست ایسے ہوتے ہیں جن سے آپ دنیا کی ہر بات کر سکتے ہیں اور دل کی ہر بات کہہ دینے میں جھجھک مانع نہیں ہوتی۔فرزانہ مجھ سے جتنی چھوٹی تھی شاہدہ اکرام مجھ سے اتنی ہی بڑی ہیں۔ میں خوش قسمت تھی کہ مجھے دائیں بائیں دو ایسی ساتھی نصیب ہوئیں جنہوں نے دامے،درمے سخنے دوستی کا حق ادا کیا۔ اور پریشانی میں ساتھ دیا۔ جب مجھے مورال سپورٹ کی ضرورت تھی۔ جب فرزانہ کو معلوم ہوا کہ ''بشریٰ اور سلائی مشین'' دو متضاد چیزیں ہیں تو خود بخود ہی بچیوں کے کپڑے خریدنے، سلوانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ کہیں سیل لگی ہے تو کبھی بچیوں کو ساتھ لے جاتی،کبھی رات بھر میں فراک سی کر لے آتی۔''میں نے سوچا بچیاں خوش ہوجائیں گی۔''

''بشریٰ! مجھے اپنا گاؤن دے دو، خانیوال جارہی ہوں''

میں نے لاکر پکڑا دیا۔''رات بھر سوچتی رہی کہ مجھے چادر کی بجائے گاؤن لینا چاہیے۔ ایسا ہی سلواؤں گی۔'' پھر اسی کو پہن لیا۔ یہ کہہ کر کہ ''جب سوچ لیا تو ابھی سے کیوں نہیں۔''

''چلو پھر یہ میری طرف سے تحفہ سمجھ لو۔'' اور وہ ہنستی ہوئی واپس چلی گئی۔ جب ہم نے گھر شفٹ کرلیا تو تھوڑی دور ہونے کے باوجود کبھی کبھار پیدل ہی آجاتی ''بس ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔''

ایک دن کہنے لگی کہ میں اندازہ نہیں کرسکتی تھی کہ دین کے حوالے سے محبت اتنی تاثیر رکھتی ہے۔ دیکھو، دیوانوں کی طرح بھاگتی آتی ہوں۔ پھر زور سے ہنسی اور کہنے لگی'' آپ سے محبت کو میں بیان نہیں کرسکتی۔ اور کسی سے بیان بھی نہیں کرتی۔''

''کیوں؟''میں نے جواباً ہنستے ہوئے پوچھا۔

''سورقیب،سوحاسد ہوتے ہیں لوگوں میں۔''

اس کا شگفتہ لہجہ مجھے اب بھی اپنے پاس ہی محسوس ہورہا ہے۔

تحریکی ذمہ داریوں کی نوعیت کوئی بھی ہوتی وہ

احسن طریقے سے ادا کرتی۔ کمپیئرنگ کرنی ہو ادبی محفل کی یا سٹڈی سرکل کرانا ہو، سرکلر لکھنا ہو، قرآن پاک کی کلاس ہو، کھانے پینے کا انتظام کرنا ہو، ورک شاپ ہو، نظامت ہو یا معاونت وہ ہر پہلو سے کام کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ سوچ بچار کرنا، کمی کوتاہی کی فکر کرنا، بہتر سے بہترین کی تلاش کرنا، راستے سوچنا، عمل کی راہیں متعین کرنا اس کے ذہن کی مشین چلتی رہتی تھی۔

پھر وہ وقت آیا کہ اس کی رکنیت کا فارم پُر کرنا تھا اسے کافی ہچکچاہٹ تھی۔ مگر میاں بیوی کے درمیان بہت اچھی انڈرسٹینڈنگ تھی۔ ہر کام ہر بات میں خالد صاحب سے مشورہ کرتی۔ انہوں نے حوصلہ دلایا۔ جب فارم پُر کر کے بھیجا تو مجھے آ کر بتایا کہ میں نے فارم میں لکھا ہے کہ ''سارا قصور بشریٰ تسینم کا ہے'' میں نے ہنستے ہوئے کہا'' میں اس ''قصور'' بلکہ ''جرم'' کا اعتراف کرتی ہوں۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی یہ قصور میرے کھاتے میں ڈال دو تو مجھے خوشی ہوگی۔''

ایک دم سنجیدہ ہوگئی ''ہاں میں ضرور گواہی دوں گی کہ اس راستے کی طرف آپ نے ہی عملی طور پر بڑھایا۔ ورنہ یہ سب نہ میرے لیے اجنبی تھا، نہ ہی کوئی نئی چیز تھی۔ سب لوگ بھی میرے واقف تھے مگر حقیقی معنوں میں راہِ حق کی ساتھی چننے کے لئے یہی وقت تھا۔''

''اللہ تعالیٰ ہماری ایک دوسرے کے لئے گواہیوں کو قبول فرمائے۔ اور اس کا مصداق بننے کے لئے ثابت قدمی بھی عطا فرمائے آمین۔''

اپنے اخلاص اور قابلیت کی بنا پر جلد ہی بیٹھک اسکول کا کام اس کے ذمے لگا۔ اور جنوبی پنجاب (جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے) کے کلیدی دفتر سے اس کا ناطہ جڑا رہا۔ ان دنوں مرکزی افراد دورے پہ آ رہے تھے۔ فرزانہ کے گھر میں میٹنگ تھی۔ خوب تیاری کر رہی تھی۔ اپنے کام کی گھر کی سیٹنگ میں مصروف تھی اور میٹنگ سے ایک دن پہلے شارٹ سرکٹ سے اس کے ڈارئنگ روم میں فرنیچر، کارپٹ، کو نقصان پہنچا۔ جو اچھا خاصا نقصان تھا۔

''اللہ تعالیٰ کی اس میں حکمت ہوگی اور شاید میں نے کچھ زیادہ ٹائم اور سوچیں اس کمرے کو سجانے میں لگایا ہوگا۔ شاید.....'' اور شکر ہے ایک کمرے سے زیادہ نہیں پھیلی آگ۔'' وہ شکر کا پہلو نکالنا بھی خوب جانتی تھی۔ اور بہت سے شاید لگا کر وہ اپنا محاسبہ کرتی رہی کہ ایسا ہونا ضرور مجھے تنبیہ کے لئے ہوگا۔

انسان کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کا جائزہ لیتا رہے۔ اور ہر غیر معمولی واقعہ سے کچھ سبق سیکھ لے۔

سب نے فرزانہ کو تسلی دی کہ تمہاری مثبت سوچ اور صبر کا بدلہ ضرور ملے گا۔ دونوں جہان میں ملے گا۔ انشاءاللہ۔

اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک شاندار گھر سے نوازا، جو اس نے اپنے حسن ذوق کے مطابق سنوار کے رکھا۔ اور بے حد شکر گزار تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کم میں آزما کر زیادہ عطا فرمایا۔

ایک بیٹی جو پیدائش سے تھوڑی دیر پہلے دنیا سے منہ موڑ گئی تھی، اس کو یاد کرتے ہوئے بہت افسردہ ہوئی۔

''میری بیٹی نے اپنی ماں کو بھی نہ دیکھا۔ وہ اس دنیا سے کتنی بے زار تھی۔ کیا اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں؟ یا آزمائش ہے؟'' پھر خود ہی کہنے لگی ''اللہ تعالیٰ کی اس میں حکمت ہوگی۔ بھلا میں کون ہوتی ہوں اللہ کے کاموں میں دخل دینے والی وہ جو چاہے کرے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس بیٹی کے بعد فرزانہ کو بیٹے سے نوازا تو بہت خوش اور اللہ کی شکر گزار تھی۔

ان دنوں میں شارجہ شفٹ ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ فون پر رابطہ کم تھا۔ ایک دن اچانک ہی آ گئی۔

''ضروری بات کرنا ہے۔''

''کہو''

''میں رکنیت سے استعفیٰ دینا چاہتی ہوں۔''

''کیوں؟'' میرے تجاہل عارفانہ کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بولی:

''یہ نہ پوچھو۔''

''اچھا، تم مناسب سمجھتی ہو تو دے دو مگر سوچ لو۔''

''یہی تو مسئلہ ہے، سوچ ساتھ نہیں دیتی۔''

''تو پھر نہ دو۔''

''دینا ہے تو پھر ایک شرط پہ دو۔'' میں نے اس کو مشورہ دیا۔

''کسی نہ کسی اجتماعیت سے جڑی رہنا۔ اس کی اہمیت تو تم جانتی ہو، اور وہ اجتماعیت اس اجتماعیت سے بہتر ہو جس سے تم جڑی ہوئی ہو کیونکہ ایک اچھی چیز چھوڑ کر بہتر ہی اپنانی چاہیے۔''

''اس سے اچھی کون سی اجتماعیت ملے گی۔'' وہ تذبذب کا شکار تھی۔

''تو پھر خود بنا لو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ آرزدہ سی ہو گئی۔

''اور اس وعدے کا کیا ہوگا جو تم نے مجھ سے کیا ہے، مجھے قصور وار ٹھہرنے کی گواہی دینے کا۔'' اور وہ خاموش سنجیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

شہر کے ایک معروف دین دار، نیک نام خاندان کے فلاحی ادارے کے تحت بڑے دعوؤں کے ساتھ سکول کھولا گیا تو فرزانہ اپنی صلاحیتوں کی بناء پر وہاں وائس پرنسپل منتخب ہو گئی۔ مگر وہ وہاں مطمئن نہ تھی۔ بہت سے خلجان تھے جن کی بناء پر ان کے ساتھ اس کا چند دن بھی نباہ نہ ہو سکا۔

نئے آنے والوں کو دیوار سے لگانا ان کی

قابلیتوں، صلاحیتوں کی نفی کرنا، ان کے مشوروں اور منصوبوں کو نا قابل عمل قرار دینا، ذمہ داری دے کر وسائل مہیا نہ کرنا، تعاون نہ کرنا، عوام اور ایوان بالا کی نظروں سے گرانے کے لیے کوئی نہ کوئی اقدام کی کوشش کرتے رہنا، دوسروں کو تعظیم وعزت ملے تو شخصیت پرستی کا نام دے کر مقررہ عہدے یا ذمہ داری سے ہٹانے کے چکر چلانا، کسی بھی ادارے، خاندان اور ملک میں اس قسم کی کشاکش انتشار کا باعث بنتی ہے۔ اور جو دین کے نام پہ قائم جماعتیں یا ادارے ہوں ان کے لئے یہ سمّ قاتل ہے۔

جو لوگ اپنی صلاحیتیں، قابلیتیں، بے لوث ہو کر نچھاور کرتے ہیں۔ اور اپنے ادارے، خاندان تحریک، سسرال، اور ملک کی بہتری کے لیے کچھ بہتر کرنا چاہتے ہیں، تجربہ کار اجارہ دار، پہلے سے کلیدی مقام پر براجمان لوگ ان کے آگے مختلف قسم کی رکاوٹیں کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ ساری دنیا کے اکثر گھروں، اداروں، تحریکوں اور ملکوں میں یہی مسئلہ ہے اور نئے کارکن جس جذبے، جوش، ولولے اور اخلاص کے ساتھ آگے آتے ہیں وہ حیران پریشان ہوتے ہیں کہ ان کو آگے لانے والے لوگ خود ہی ان کی قابلیت وصلاحیت کی نفی کرنے لگتے ہیں۔ مسائل کو حل کرنے کا چیلنج دے کر وسائل دینے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ ایک لکیر کھینچ دی جاتی کہ اس سے آگے آنا منع ہے۔ تحفظات کی ایک لمبی لسٹ ہوتی ہے جس کو سامنے رکھ کر باور کرایا جاتا ہے کہ اگلی صفوں میں آنے سے یا پرانے لوگوں کو جگہ خالی کرنے کے بعد بہت سے ان کہے خدشات لاحق ہو سکتے ہیں۔ ایک فرد کی خاندان پہ اجارہ داری ہو یا خاندان کی کسی ملک یا جماعت پہ یا ایک گروپ کی کسی ادارے میں من مانی، ہمیشہ ترقی معکوس کا باعث بنتی ہے۔

ہم شارجہ شفٹ ہو گئے تو رابطے مشکل ہو گئے۔

دبئ ایسوسی ایشن کے تحت مشاعرے میں شرکت کے لئے گئے تو وہاں جناب خالد صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے گزارش کی

''فرزانہ کو بھی لے کر آیئے گا آئندہ۔''

''جی انشاءاللہ کوشش کروں گا۔''

اور میں خالد بھائی کی متوقع کوشش کو سامنے رکھ کر فرزانہ کا انتظار کرنے لگی..... پاکستان آنا ہوتا تو پہلی فرصت میں فرزانہ کو فون کرتی اور اس سے سب حال احوال سنے جاتے۔

آخری ملاقات ارکان کے اجتماع میں ہوئی جو اسی کے گھر پہ تھا۔ پروگرام ختم ہوا تو میرا ہاتھ دبا کر سرگوشی میں بولی۔

''تم رک جاؤ بعد میں ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔''

جب سب چلے گئے تو بہت سی باتیں کیں۔ اپنی تکلیف کا بتایا کہ مجھے یرقان کی تکلیف ہو گئی ہے، علاج ہو رہا ہے۔

جب حمیرا یاسمین نے مجھے بتایا کہ فرزانہ کی

طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو مجھے بہت فکر وتشویش ہوئی۔شاید دوائی جعلی تھی، یا دوائی کے سائڈ ایفیکٹ کی وجہ سے تکلیف میں اضافہ ہوگیا ہے۔آغا خان سے علاج ہورہا ہے۔

وقتاً فوقتاً اس کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ اورایک دن یہ خبر''فرزانہ اکا انتقال ہوگیا ہے''سن کر دل بے حد آرزدہ ہوا کہ اپنی عزیز ساتھی کی''رخصتی'' کے وقت میں موجود نہ تھی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**

میں سوچتی ہوں فرزانہ کی شدید بیماری کو میں نے نہیں دیکھا۔اس کا اچھا پہلو یہ ہے کہ وہ مجھے ہنستی مسکراتی، چُست کام کاج کرتی ہی نظر آتی ہے۔یہاں پردیس میں کوئی نہ تھا۔جس کے پاس بیٹھ کر میں اس کو یاد کرتی اور سننے والا میرے جذبات کو سمجھ پاتا۔ فرزانہ کی صورت کسی وقت نظروں سے نہ ہٹتی تھی ایک دن حمیرا یاسمین نے ہی خاص طور پر فون کیا کہ

''باجی! میں نے خاص طور پر فرزانہ کی باتیں کرنے کے لئے فون کیا ہے۔''

فرزانہ سے حمیرا کی ملاقات اس کے انتقال کے چند دن پہلے ہی ہوئی تھی۔فرزانہ نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ مجھے حمیرا میں تمہاری شکل ہی نظر آتی ہے۔تم چلی گئی ہوتو اس کو دیکھ کر تسلی ہوجاتی ہے۔

حمیرا نے بتایا کہ حج پر جاتے ہوئے جو دعاؤں کی کتاب ہے ہم دونوں نے فرزانہ کو دی تھی وہ اس کو بہت پسند آئی تھی۔اور عرفات میں خاص طور پر ہم دونوں بہنوں کو دعا میں خاص طور پر یاد رکھا۔اور حمیرا نے بتایا کہ فرزانہ آپ کو یاد کررہی تھی بہت زیادہ۔اور بتارہی تھی کہ

''حج کے بعد طواف زیارت کرکے میں حجرِ اسود کے سامنے سیڑھیوں پہ بیٹھ کر بشریٰ تسنیم کو یاد کرتی رہی۔اسی وقت ایک خاتون میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔مجھے لگا یہ بشریٰ ہی ہے۔تصور کو ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر میں نے اس خاتون کی طرف نہ دیکھا کہ میرا گمان مضبوط رہے۔اور وہیں بیٹھ کر بشریٰ اس کی بیٹیوں کے لئے دعا کرتی رہی۔اور مجھے لگا کہ میں اور بشریٰ ایک ساتھ اتنی پیاری جگہ پہ بیٹھے ہیں۔''یہ سن کر میں نے بے اختیار کہا

.....سبحان اللہ.....!دلوں کے مضبوط رشتوں کی بنیاد، اللہ تعالیٰ کا نام ہے تو ایسی پیاری جگہوں پر اس قسم کے خوب صورت مشاہدے اور تجربے ایک دوسرے کے لئے ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرزانہ کی نیکیوں کو وہ شرف قبولیت عطا فرمائے جس کا نتیجہ انبیاء، صدیقین اور شہیدوں کا ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرزانہ خالد کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ بیماری کا وقت جس طرح صبر، حوصلے سے گزارا۔ وہ اس کے حسنات میں اضافہ کا باعث بن جائے۔اور خطاؤں کے کفارے کا سبب بن جائے۔اس کی اولادوں کو صدقۂ جاریہ بنائے گھر والوں کو

صبر جمیل سے نوازے آمین۔

حمیرا نے مجھے بتایا کہ ''باجی! فرزانہ کی ''رخصتی'' کی تیاری میں نے بھی کرائی تھی۔اس کے لہجے میں وہ خاص بات تھی جو کہ مجھے قرار دے رہی تھی کہ میری بہن نے وہ کام کیا جو مجھے کرنا تھا۔میرے حصے کا کام اس نے کر دیا۔اور فرزانہ بھی حمیرا سے بہت خوش اور مطمئن تھی۔

وہ جس نے میری گواہی دینے کا وعدہ کیا تھا وہ مجھ سے پہلے چلی گئی۔اور اس نے آخر دم تک اپنے اس عہد کو بھی نبھایا جو اس نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا۔بیماری کے باوجود وفات سے کچھ عرصہ پہلے حج فورم کا پروگرام کیا۔اور جب جو ڈیوٹی دی گئی اس کو اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ نبھایا۔

''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں،جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ۔ان میں سے کوئی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔''(الاحزاب)

ہم جو اپنے وقت کے منتظر ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان پہ استقامت عطا فرمائے اور اپنے عہد کو اور نذر کو پوری کرنے کی سعادت سے نواز دے آمین۔

☆☆☆

کچھ بوسنیا کے بارے میں

جہاں برف پڑتی ہے..... وہ ایک دیس ہے بلکہ پردیس ہے، بہت دور ہے پر دل کے بہت قریب ہے ..... یہ بوسنیا کا ایک چھوٹا سا شہر سرائیو ہے۔ ایسے ہی سمجھیں جیسے لاہور کا ایک حصہ۔ لیکن مضبوط اور بلند و بالا عمارات سے گھرا ہوا، برف سے ڈھکا ہوا، پہاڑوں اور دریاؤں کے بیچ، روشنیوں سے مزین، نیلی آنکھوں ،سنہری بالوں اور گوری رنگت والوں کی آماجگاہ.....اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن جب دیکھا تو ایک احساس تازہ نے گدگدایا..... ''یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے'' لیکن نہیں وہ تو صرف تصور تھا گزرتو اب ہوا ہے۔

میرے سفر کا آغاز اسلام آباد سے ہونا تھا کیونکہ ٹرکش ایئر لائن وہیں سے چلتی ہے۔ اس لیے لاہور سے اسلام آباد، اسلام آباد سے ترکی.....یعنی استنبول ..... اور پھر سرائیو.....اسلام آباد سے فلائٹ ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے چلی اور استنبول سے سرائیو کے لیے چار گھنٹے لیٹ .....پھر نہ راستوں کا پتہ تھا نہ ہماری زبان کوئی جانتا تھا ۔تھوڑا بہت انگریزی سے کام چلایا۔ غرضیکہ ایک لمبا اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ لیکن جب دل خوش ہو تو کوئی رکاوٹ آڑے نہیں آتی۔ ترکی کے وقت کے مطابق پانچ بجے جہاز چلا اور ڈیڑھ گھنٹے میں ہم سرائیو کے ایئرپورٹ پر تھے۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ موسم کو دیکھ کر خیال آیا'' پتہ نہیں شہاب بیٹا آیا ہوگا کہ نہیں، اس خیال سے دل زور زور سے دھڑکنے لگا، ''نئی جگہ، نیا ماحول، نئے لوگ، نئی زبان'' بعض اوقات انسان خدشات ہی میں مفروضے گھڑتا رہتا ہے۔ ہوتا کچھ بھی نہیں یہی میرا حال تھا استنبول سے ایک اچھی ہمسفر مل گئی تھیں .....انھوں نے ڈھارس بندھائی بلکہ میرا سوٹ کیس بھی خود ہی اٹھایا، باہر نکلے تو سامنے شہاب بیٹی کو گود میں لیے کھڑا تھا، تسلی ہوئی اور ان خاتون کا شکریہ ادا کیا جن کے اخلاق نے مرعوب کیا تھا۔ پھر گھر آئے اور باتیں کرتے کرتے ہی صبح ہوگئی۔

شہاب سرائیو یونیورسٹی میں انگریزی کا استاد ہے ۔اس نے پی ایچ ڈی بھی وہیں سے کی ہے اور شیکسپیئر پر عبور حاصل ہے ان دنوں یونیورسٹی میں امتحان ہو چکے تھے، کوئی خاص کام نہیں تھا اس لیے شہاب نے ایک ہفتہ کی چھٹی لے لی تھی ویسے بھی اس کی کلاسیں سیکنڈ شفٹ میں ہوتی ہیں یعنی دو بجے سے رات کے آٹھ بجے تک.....اس چھٹی سے ہم نے بہت فائدہ اٹھایا اور خوب سیر کی ۔ یہ جنوری کا آخری ہفتہ تھا۔ سخت سردی

تھی، روزانہ برف پڑتی یا بارش ہوتی رہتی۔ میں ایک مہینہ وہاں رہی اس عرصے میں شاید دو یا تین دفعہ دھوپ نکلی ہوگی.....

شہاب کا چھوٹا سا گھر آٹھویں منزل پر ہے، یہ فلیٹ یونیورسٹی سے بھی قریب ہے اور ہر طرح کی مارکیٹ سے بھی۔

آٹھویں منزل پر ہونے کی وجہ سے ہر طرف کے نظارے بڑے واضح تھے۔ چاروں طرف برف ہی برف ہوتی ..... درخت، پہاڑ، سڑکیں، گھر، اور گاڑیاں، سب کو برف میں لپٹا ہوا دیکھا۔ پھر اس کو قطرہ قطرہ پگھلتے ہوئے بھی دیکھا۔ پہاڑوں پر بنے ہوئے گھروں میں جب رات کو روشنیاں جلتیں تو لگتا لال پیلی نیلی روشنیاں آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی ہیں۔ یہ خوبصورت مناظر نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے۔ اب بھی نظروں کے سامنے ہیں۔ کھڑکی میں کھڑی ہوں اور باہر وہی سب۔

وہاں پر ٹرام چلتی ہے، بسیں اور ٹیکسیاں بھی رواں دواں رہتی ہیں، کرائے بھی مناسب ہیں۔ ٹیکسیاں اپنے میٹر کے مطابق کرایہ لیتی ہیں۔ فون کریں تو دو منٹ میں ٹیکسی گھر پر کھڑی ہوتی ہے۔

لیکن ہم نے زیادہ سفر گاڑی اور ٹرام میں کیا، جب برف باری ہوتی اس دن ہم لوگ ٹرام سے جاتے تھے۔ ہر پانچ منٹ بعد ایک ٹرام آتی اور جاتی ہے۔ اس میں زیادہ تر طالب علموں کو سفر کرتے دیکھا..... غرضیکہ آنے جانے کا بہت اچھا نظام ہے۔ کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہیں آتی..... یوں ہم نے خوب سیر کی، کبھی ٹرام میں، کبھی ٹیکسی میں اور کبھی گاڑی میں۔

شہاب کی یونیورسٹی دیکھی۔ اس کے سامنے بہت بڑا شاپنگ پلازہ ہے، جس میں ہر طرح کی بے شمار دکانیں، ہوٹل، بچوں کے کھیل کا سامان ہے۔ ایک کمرہ ایسا تھا جہاں بے بی سٹنگ کا انتظام تھا یعنی مائیں بچوں کو وہاں چھوڑ کر شاپنگ کرتی ہیں۔

سرائیو سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر ایک اور یونیورسٹی ہے۔ وہاں شہاب ہفتے میں ایک دفعہ پڑھانے جاتا ہے۔ وہاں بھی وہ مجھے لے کر گئے۔ یونیورسٹی دیکھی اور خوبصورت راستہ بھی..... یہ یوں ہے کہ پہاڑ کے ساتھ دریا بہتا ہے اور اس کے ساتھ اونچائی پر سڑک ہے بہت خوبصورت پہاڑی راستہ ہے، سڑک کے زیر و بم اور پر پیچ موڑ دیکھ کر سوات اور مری کی یاد تازہ ہوگئی۔ سڑک بہت چوڑی ہے۔ اس لیے زیادہ خطرناک نہیں لگی۔ یہ شہر موشاد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس شہر کی خوبی یہ ہے کہ یہاں دریا کے اوپر ایک پل ہے جو دو شہروں کو ملاتا ہے..... اس لیے ایک شہر سے دوسرے شہر رسد لانے لے جانے کا کام لیا جاتا ہے۔ لیکن جنگ کے دوران اس کو توڑ دیا گیا تھا تاکہ دشمن دوسری طرف نہ آ سکے۔ اس پل کی خوبی یہ ہے کہ یہ دریا کے سب سے بڑے پاٹ پر بغیر کسی ستون کے کمان (Arch) کی طرح کھڑا ہے، اس لیے یہ دنیا

کے فن تعمیر کا اہم ڈیزائن ہے۔ یہ بوسنیا کے حکمران سلطان سلیمان نے تعمیر کرایا تھا اور اس کو ترکی کے معماروں نے بنایا تھا۔ دوبارہ تعمیر کیا گیا، ایک ایک پتھر کو ویسے ہی لگایا گیا جیسے پہلے تھا اس لیے یہ تاریخی پل کہلاتا ہے کیونکہ اس کی دوبارہ تعمیر کا احساس نہیں ہوتا۔

یونیورسٹی کے راستے میں ایک سٹیل مل بھی دیکھی جس کے بارے میں شہاب نے بتایا کہ یہ یورپ کی چند بڑی ملوں میں شمار ہوتی ہے۔ جہاں کسی زمانے میں نو ہزار مزدور کام کرتے تھے ..... یونیورسٹی بہت بڑی اور بہت خوبصورت ہے۔ کئی منزلیں تھیں جن پر آنے جانے کے لیے لفٹ استعمال کی جاتی ہے۔ سرائیو کے آس پاس کے کئی شہر ہم نے دیکھ لیے وہاں گاڑی سے جاتے تھے تاکہ رکتے ہوئے جائیں ..... ہر شہر کا فاصلہ ڈیڑھ دو گھنٹے کا تھا۔

ہر جگہ گٹر اور ہیٹر میری توجہ کا مرکز رہے ..... گٹر اس طرح کہ سڑکیں کناروں سے کچھ ترچھی ہیں بیچ میں لوہے کے بڑے بڑے گٹر جن میں سوراخ تھے۔ جب برف پڑنے کے بعد پگھلنی شروع ہوتی تو وہ پھسل کر گٹر میں آ جاتی اور یوں پانی بن کر اندر چلی جاتی۔ اس طرح سڑک کے کناروں پر پانی کھڑا نہیں رہتا تھا اور زمین خشک ہو جاتی۔

اسی طرح ہر جگہ گرم پانی کے ہیٹر دیکھے جن سے پورے گھر گرم رہتے۔ کہیں کہیں کوئلے کے بھی ہیٹر تھے لیکن لکڑی مہنگی ہونے کی وجہ سے کم لوگ یہ استعمال کرتے ہیں۔

سڑکیں چھوٹی چھوٹی ہیں یعنی گاڑیوں کی ایک لائن جا سکتی ہے اور ایک آ سکتی ہے۔ سب لائنوں میں چلتے ہیں نہ کسی کو آگے نکلنے کی جلدی ہوتی ہے نہ کوئی ہارن کے شور سے کسی کو تنگ کرتا ہے۔

وہاں پر پرانے شہر بھی ہیں جیسے ہمارا رنگ محل اور شاہ عالمی۔ وہاں گاڑی نہیں جا سکتی۔ لوگ پیدل ہی گھومتے ہیں اور شاپنگ کرتے ہیں۔ دوکانیں بڑی خوبصورتی سے سجائی جاتی ہیں۔ موسم اچھا ہو تو دکان کے باہر میزوں پر میز پوش ڈال کر پلیٹوں میں چیزیں رکھی ہوتی ہیں۔ شالیں سوئٹر وغیرہ ہینگر میں لٹک رہے ہوتے ہیں، دیواروں پر بھی سامان سجا ہوتا ہے۔

یہاں کا راستہ چھوٹے بڑے پتھروں سے بنا ہوا تھا بلکہ اکثر خوبصورت رنگ برنگے پتھروں کے ڈیزائن بنے ہیں۔ ایک علاقہ ایسا تھا جہاں اب تو دکانیں ہیں لیکن کسی زمانے میں وہاں سرائے تھی ..... بیچ میں صحن اور چاروں طرف دکانیں ..... اس کی بھی دو منزلیں تھیں پوری عمارت لکڑی کی بنی ہوئی، دروازوں پر بڑے خوبصورت نقش و نگار تھے۔

اس جگہ زیادہ لوگ سیر و تفریح کے طور پر آتے ہیں ..... سیاح بھی ہوتے ہیں۔ سامان زیادہ تر ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے، ایک کارخانہ بھی تھا جہاں پر پیتل کا کام ہو رہا تھا وہاں کھانے پینے کے ہوٹل بھی ہیں جہاں ہر طرح کا کھانا مل جاتا ہے۔ ہم لوگ جب

بھی وہاں کھاتے تھے تو کباب لیتے تھے۔ وہ بالکل پاکستانی سیخ کبابوں کی طرح تھے یا چکن روسٹ۔ یوں جب بھی سیر کے لیے نکلتے سارا دن لگ جاتا تھا۔

اسی علاقے میں بہت پرانی مسجد بھی ہے جس کی تاریخ پانچ سو سال پرانی ہے۔عصر کی نماز وہیں ہوتی تھی۔ وہاں باہر نماز پڑھنے کا دستور نہیں ہے شاید سردی کی وجہ سے۔ یہ مسجد بھی لکڑی اور پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ بہت بڑے بڑے کمرے ہیں صحن بھی زیادہ کھلا و وسیع نہیں ہے.....لیکن لکڑی کا کام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔آیات بھی بڑے خوبصورت انداز میں لکھی ہیں۔

مسجد کو تالا لگا رہتا ہے لیکن نماز کے وقت امام صاحب آتے ہیں تالا کھولتے ہیں اور نمازی اندر جا کر نماز ادا کرتے ہیں۔ باہر ایک طرف صحن میں گول سا کمرہ نما حوض ہے جس کے چاروں طرف سے پانی بہتا رہتا ہے،نل کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ نہیں ہے وہ پانی ٹونٹی میں سے بہتا رہتا ہے یہ چشمے کا پانی ہے جس سے لوگ وضو کرتے ہیں یا پینا چاہیں تو پی بھی لیتے ہیں۔

میں نے جہاں نماز پڑھی وہ خواتین کا حصہ تھا، دوسری طرف مرد تھے،جن کی تعداد خواتین سے زیادہ تھی ۔خواتین میں بھی زیادہ تر عمر رسیدہ خواتین تھیں۔نوجوان لڑکیاں بہت کم تھیں۔ یوں اس مسجد کی بناوٹ بھی مجھے بہت اچھی لگی۔ جو ایک پرانی تاریخ رقم کر رہی ہے۔ جنگ کے دوران مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔وہ اپنی اصلی حالت میں اسی طرح قائم ودائم ہے۔کوئی خرابی ہو تو فوراً مرمت ہو جاتی ہے۔

ایک بہت بلند گھنٹہ گھر بھی ہے اس کی تاریخ بھی پانچ سو سال پرانی ہے۔ اس کے اوپر کے حصے پر بم لگنے سے خرابی ہوگئی تھی وہ ٹھیک کر دیا گیا ہے۔

میں نے تو وہاں جنگ کے کوئی آثار نہیں دیکھے،صرف ایک لائبریری تھی جس میں مذہبی اور اسلامی کتابوں کا وسیع ذخیرہ تھا،اس کو جنگ میں بالکل ختم کر دیا گیا کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔صرف جلی ہوئی عمارت ہے۔ دروازے کھڑکیاں تک جلا دیے گئے، یوں کہیں کوئی پرانی تاریخ موجود نہیں جس کا افسوس ہوا۔کوئی پرانی کتاب نہیں چھوڑی۔سرائیوجیسے چھوٹے شہر میں چار میوزیم ہیں۔ ایک میں ان دنوں کام ہو رہا تھا وہ بند تھا..... باقی تین میوزیم میں نے دیکھے۔

ایک میوزیم وہاں کے سلطان کی رہائش گاہ تھی۔ وہاں بہت قیمتی لکڑی کے نقش ونگار کا سامان تھا۔کپڑوں پر سونے چاندی کا کام تھا،خوبصورت قالین اور پردے ،ایک کمرے میں بچے کا چاندی کا جھولا تھا اور چاندی کے آفتابے،ڈونگے اور دوسرے برتن سجے تھے..... ہر چیز بہت خوبصورت اور قیمتی تھی..... جو شیشے کے کمروں میں سجا تھا یہاں تک کہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بھی شیشے کی تھیں جو میں نے پہلی دفعہ دیکھی تھیں اور ان پر چلتے چلتے قدم خود بہ خود رک جاتے.....اس کی تاریخ

بھی چھ سو سال پرانی ہے۔

دوسرا میوزیم کسی غریب کی رہائش گاہ تھی اس میں بھی تمام سامان ہر کمرے میں سجا تھا.....ایک خواتین کا کمرہ تھا جہاں وہ سلائی کڑھائی کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ اڈہ بھی تھا ہاتھ کا بنا ہوا اتنا نازک اور حسین کام کہ حیرت ہوتی..... یہ پورا لکڑی کا بنا ہوا ہے۔

تیسرا میوزیم وہ ہے جہاں بوسنیا کی پوری تاریخ رقم ہے پرانے زمانے کے ہتھیار، جنگوں میں لڑنے کے طریقے ..... اس زمانے کے کھانے کے طور طریقے .....یعنی بوسنیا کی پوری تاریخ جنگ ہونے تک کی ، وہاں موجود ہے لیکن اب وہاں پر جنگ کے کوئی اثرات ہیں نہ باقیات۔ مجھے تو وہ امریکہ یا لندن کا کوئی شہر لگا، وہی موسم، وہی لوگ، وہی لباس، وہی طور طریقے، سب کو جیکٹ اور جینز میں دیکھا، شاذ و نادر ہی کوئی اسکارف والی نظر آئی۔

اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک میں تعلیم مفت ہے۔ علاج کی سہولت بھی مفت ہے۔ یہاں تک کہ بچے کی پیدائش پر ایک سال تک اس کا پورا خرچ بھی حکومت دیتی ہے۔ ہسپتال بھی دیکھا، نہ پرچی کی لائن، نہ لوگوں کا شور وغوغا، نہ درختوں کے نیچے تیمار دار۔ صاف ستھرا ہسپتال دیکھ کر اپنے گورنمنٹ کے ہسپتالوں کا خیال آیا۔

کھانے پینے کی چیزیں بھی خالص ہوتی ہیں اور دام بھی مناسب اکثر دکانوں کے آگے بنچ ہوتے ہیں جن پر بوڑھی خواتین اور مرد ہاتھ کا بنا ہوا سامان لے کر بیٹھے نظر آئے۔ کچھ لوگ بڑی بڑی بوتلوں میں دودھ لیے کھڑے تھے۔ شہاب نے کئی دفعہ وہ دودھ لیا۔ جب بھی ہم ادھر سے گزرتے شہاب وہ خرید لیتا۔ اس نے بتایا کہ یہ لوگ گاؤں سے دودھ لے کر آتے ہیں جو پیکٹ کے دودھ کی نسبت خالص ہوتا ہے۔ یوں وہ لوگ روزی کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ سب اچھے موسم کی باتیں ہیں۔ اس کے گھر میں بھی گرم پانی کے ہیٹر ہیں جو میں نے پہلی دفعہ دیکھے ..... یہ میرے لیے خاصے حیران کن تھے۔ اور بھی بہت کچھ نیا دیکھا..... جو میرے لیے اچھا تجربہ تھا۔

ان کے ملنے والوں اور رشتے داروں نے دعوتیں بھی کیں۔ خواتین خود ہی سب کچھ بناتی ہیں۔ کھانے سادہ ہوتے ہیں یعنی نمک مرچ بہت کم، میز کے اوپر باقاعدہ دسترخوان بچھایا اور اٹھایا جاتا ہے۔

کھانے کا کمرہ اور کچن عموماً اکٹھے ہی ہوتے ہیں ۔اسی میں فرج، چولہے، برتن دھونے کی مشین، اون غرضیکہ سب کچھ تھا۔ نئے کھانے، مزیدار اچار، چٹنیاں اور مربے خواتین خود بناتی ہیں۔ گھر بھی چھوٹے ہوتے ہیں لیکن آرام دہ۔ لوگ بوسنین بولتے ہیں انگریزی بھی کم ہے وہاں سب کچھ ہے، بہت اچھا ہے لیکن ایک خلش مسلسل مجھے کریدتی رہی کہ یہاں سب کچھ بہت اچھا ہے مسجدیں، درس گاہیں، اسکول، ہسپتال، دکانیں، لوگ، نئی اور پرانی تہذیب ، ..... پرانی

تہذیب کی حفاظت بھی۔

لیکن کاش کہ اسلام کا بھی بول بالا ہوتا۔کوئی اپنا ہم زبان، ہم خیال بھی ہوتا پھر ہمیں وہاں رہنا اور بھی اچھا لگتا!

☆☆☆

احساس کے رنگ

2006ء میں پکارِ ملت میں شائع ہونے والی حفصہ اکرام (مرحومہ) کی ایک تحریر

سوچتی ہوں اللہ میاں.....آج آپ کو سب سے انوکھا، سچا اور قیمتی خط لکھوں۔ ڈھیروں خطوں میں ایک خط آپ کے نام ہو۔

بچپن ہی سے آپ جیسی عظیم ہستی کے وجود کا احساس دل میں ڈال دیا گیا تھا کہ آپ ہر لمحہ اور ہر جگہ موجود اپنے بندوں کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ خوف ومحبت بھی دل میں جاگزیں کر دی گئی کہ شعور کی حد تک پہنچتے پہنچتے لفظ ''اللہ'' سے مکمل واقفیت حاصل ہوگئی اور یقین ہوگیا کہ آپ میرے ساتھ ساتھ ہیں، قریب ہیں، خوشی وغمی کا بہترین سہارا ہیں، غمگسار ہیں، سچے دوست ہیں، ہر شے آپ کی محتاج ہے، سمیع وبصیر ہیں، علیم وخبیر ہیں، رؤف ورحیم ہیں، فیاض ہیں۔

آپ میرے رب ہیں، پروردگار ہیں۔ غفور ورحیم ہیں۔ کتنا پیارا نرم ونازک سا نام ہے آپ کا ''ربّنا'' جس کا تصور کرتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں اور آنکھوں میں شمع سی جلنے لگتی ہے۔ جس کا احساس روح وقلب کو شاد کر دیتا ہے۔ اگرچہ اس کا اظہار زبان سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن دراصل یہ وہ جذبات ہیں، وہ احساسات ہیں جو دل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ کی صفت الرحیم، الودود ہے، جو ماؤں سے ستر گنا بڑھ کر پیار کرنے والی ہے۔ شفقت کرنے والی ہے۔ آپ مجھے اس وقت سہارا دیتے ہیں جب میں شدت غم سے نڈھال ہوجاتی ہوں۔ یہ صفت میرے رہبر ﷺ کی طلب تھی جو اپنے جانی دشمنوں کو صرف اتنا کہہ دیتے تھے ''اے اللہ تو انہیں معاف کر دے یہ جانتے نہیں ہیں۔'' بارہا میں نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ آپ سے فریاد کی اور رحم کی التجا کی تو میں نے آپ کو اپنے قریب پایا۔ آپ کی رحمتوں کو میں نے یوں محسوس کیا جیسے میرے سر پر آپ کا دستِ شفقت ہو اور یوں میرے دل میں طمانیت سی اتر گئی۔ جب کبھی زیست کی راہ پر چلتے چلتے میرے قدموں میں لغزش آنے لگی تو آپ نے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔

آپ کا یہ احسان عظیم زندگی بھر نہ بھولوں گی۔ حضرت علیؓ کے مطابق میں نے بھی آپ کو آپ کی صفات مبارک اور اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔

آپ نے سچ کہا ''سمندر سیاہی اور درخت قلم بن جائیں تو بھی تعریف ختم نہ ہو۔'' صاحقتیں، نورِ ہدایت، قرآن جیسی نعمتوں سے نوازنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ہی مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں، آپ ہی نے فرمایا ''تبتل الیہ تبتیلا'' یہ الفاظ محبت

صرف آپ کے لئے ہیں۔ یہ بھی آپ نے فرمایا ہے کہ
''اِذسٔالك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اِذادعان''
آپ شہ رگ سے بھی قریب تر ہیں۔ مجھے میری انگلی تھام کر اس طرح سے رہنمائی دی کہ کہیں ٹھوکر نہ کھا جاؤں۔
سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم
آپ کا حلم مجھ گنہگار کے لئے کتنا زیادہ ہے کہ میں نافرمانی کرتی ہوں آپ عطا کرتے ہیں۔

میرا ہی ناصبور دل شکر بجا نہ لا سکا
تیری نوازشوں میں تو کوئی کمی ہوئی
نہیں

آپ مجھے اکثر گھڑیوں بہت یاد آتے ہیں۔ میری دوستی آپ سے اس شخص کی طرح ہے جس کی صرف ایک بااختیار شخص سے دوستی ہو اور اسی تعلق کی بقا کا اسے ہر دم خیال ہو۔ آپ اکثر تنہائی میں مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا میں تم سے محبت نہیں کرتا؟ مہربانی نہیں کرتا؟ تو اس احساس کے بعد میں کسی فرد و بشر سے نہیں ڈرتی۔ اگر واقعات و تجربات کی روشنی میں یہی نصیحت سامنے آئی کہ آپ ہی اصل دوست ہیں۔

وہ ربط دوستی جسے پائندہ کہہ سکیں۔
ملتی نہیں یہ چیز مگر چاہیے مجھے

یہ التجا آپ سے ہے۔ آپ ضرور اس کو پورا کریں گے۔
آپ کی محبت کی پیائش اطاعت سے ہوتی ہے۔
تو اے میرے رب، اے میرے معبود، اے میرے آقا، اے زیست کی سب سے محبوب ہستی! میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ اپنی بے پایاں رحمت کی وجہ سے مجھے ہمیشہ ہدایت کے طلبگاروں میں رکھئے گا۔ آمین۔
آپ منتقم بھی ہیں، جبار بھی۔ مجھے توفیق دیں کہ میں آپ کے انتقام سے بچ سکوں کہ آپ رحیم بھی تو ہیں ناں۔ آپ ہی نے مجھے وہ توفیق بخشی کہ میں آپ کے سامنے آپ کے لئے اپنی محبتوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار کر سکوں کہ آپ عالی شان ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ سے وہ پیار کروں جس کے آپ لائق ہیں۔ آپ کی ذات میں گُم ہو کر خود کو بھول جاؤں۔

جب دنیا میں محبتیں اور عقیدتیں
میرے مضطرب دل کو
سکون دینے میں مات کھا جائیں
تو پھر تیری رحمتوں اور شفقتوں کی انتہا
مجھے پھر سے سبک رفتار کر دے
اے خدا! تو یاد آتا ہے

آپ سے دعا کرنے میں بڑا اطمینان ملتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ میرے بالکل قریب، میری حاجات کو بڑے غور سے سن رہے ہیں۔ تو پھر آخر میں

میری ایک التجا ضرور سنیے گا۔یہی میری حاجت اور آرزو ہے۔

اے میرے خالق! اگر کبھی میرے دل کا دروازہ بند ہو جائے تو آپ مجھے تنہا نہ چھوڑ دیجیے گا بلکہ اس بلند دروازے کو اپنی رحمت اور کرم سے کھول کر میرے دل کے اندھیروں کو دور کر دیجیے گا۔

یہ میری تمنا ہے..... یہی آرزو..... اپنی رحمت کو واپس نہ کر دیجیے گا۔ اگر کبھی میرے دل کا ستار آپ کی الفت کا گیت نہ گا سکے تو مجھ پر اپنا خاص کرم کیجیے گا۔ یہ عنایت چاہتی ہوں، ہوسکتا ہے میں اپنے دل کو، جو صرف آپ کے لئے خالی ہے، کسی دوسرے کی نذر کر دوں تب میرے مالک اس دوسرے تعلق کو اپنی محبت کے تابع کر دیجیے گا۔ مجھے اپنی رحمت اور بخشش سے دور نہ کر دیجیے گا بلکہ مجھے صرف اور صرف اپنا بنا لیجیے گا۔ ایسا اپنایئے گا کہ میرے دل کے ہر گوشے میں آپ کے تعلق کی وجہ سے نور بکھرا ہو۔ آمین۔

☆☆☆

اعجاز احمد

محکمہ تعلیم کا ایک اشتہار

گزشتہ دنوں کچھ اخباروں میں محکمہ تعلیم خیبر پختون خوا کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا، جس میں اسکول کے بچوں بچیوں کے والدین سے استدعا کی گئی ہے کہ اگر کسی کے بچے کو اسکول میں جسمانی سزا دی جائے تو اس کی اطلاع اس ٹول فری نمبر پر دی جا سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں پر جسمانی تشدد قابل نفرت اقدام ہے اور کوئی مہذب اور فلاحی معاشرہ بچوں کو سخت بدنی اذیت اور سزا کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بچے جس طرح پیار، محبت اور شفقت سے بات سمجھ سکتے ہیں، اس طرح وہ جبر، تشدد اور ڈنڈے سے نہیں سمجھ سکتے، مگر بعض اوقات مخصوص حالات کے پیش نظر بچوں پر اصلاح کی خاطر کسی حد تک زور اور دباؤ کا استعمال بھی جائز اور ضروری ہو جاتا ہے۔

جس طرح ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح سارے بچے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ بچے پیار اور محبت کی زبان سمجھتے ہیں اور کچھ بچے پیار اور محبت کی بات نہیں سمجھتے، لہٰذا اگر بچے پیار اور محبت سے راہِ راست پر نہ آئیں تو اصلاح احوال کی خاطر کسی حد تک سزا دینا ضروری ہے۔ اسلام تمام بنی نوع انسان کے ساتھ عدل، مساوات اور میانہ روی کا درس دیتا ہے، چنانچہ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ زندگی کے تمام معاملات میں میانہ روی، انصاف اور اعتدال سے کام لیں۔ بچوں کے ساتھ نہ حد سے زیادہ محبت کرنی چاہیے اور نہ حد سے زیادہ سختی سے پیش آنا چاہیے، بلکہ میانہ روی ہونی چاہیے۔ اگر ہم اسلامی تعلیمات پر نظر ڈالیں تو نماز کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو محبت اور پیار سے نماز پڑھنے پر آمادہ کرنا چاہیے اور جب بچہ دس سال کا ہو جائے، پھر وہ نماز نہ پڑھے تو اس کے ساتھ سختی سے پیش آنا چاہیے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں کسی حد تک بدنی سزا کا تصور موجود ہے۔ بچے اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں کر سکتے، لہٰذا بگڑے ہوئے بچوں کی اصلاح اور راہ راست پر لانے کی خاطر سزا دینا ضروری ہے۔

آج کل وطن عزیز کے مختلف حصوں اور بالخصوص خیبر پختون خوا میں دیواروں پر اشتہار اور بینرز لگے ہوئے ہیں جن میں اسکولوں میں سزا دینے کے مسئلے کو اٹھایا جا رہا ہے اور ان اشتہاروں اور بینروں سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خیبر پختون خوا کے اسکولوں میں طالب علموں پر انتہائی تشدد اور ظلم ہو رہا ہے۔ دراصل

وطن عزیز کے کچھ لا مذہب مغرب زدہ این جی اوز اس کوشش میں ہیں کہ یورپ اور مغرب کی طرح بچے اسکول اور گھر میں کچھ بھی کرتے رہیں، والدین اور اساتذہ خاموش تماشائی بن کر کھلی آنکھوں سے بچوں کے سارے منفی کرتوتوں کو بے بسی سے دیکھتے رہیں۔ یہ مغرب زدہ اور لا مذہب این جی اوز پاکستان میں امریکا اور دوسرے مغربی ممالک کی طرح ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتی ہیں جہاں پر والدین اور اساتذہ بچوں اور شاگردوں سے ایک جائز بات پر بھی باز پرس سے قاصر ہوں۔

مغرب میں اگر والدین اپنے بچوں سے غلط کرتوتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو بچے تھانے فون کر کے والدین کو پابند سلاسل کرتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو پاکستان میں جو این جی اوز اسکولوں میں سزا دیے جانے کے بارے میں ''تشویش'' میں مبتلا ہیں، ان کا مقصد اصلاح نہیں بلکہ بچوں پر اساتذہ اور والدین کے کنٹرول کو ختم کرنا ہے تاکہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہو جہاں پر والدین اور اساتذہ اور والدین کے کنٹرول کو ختم کرنا ہے تاکہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہو جہاں پر والدین اور اساتذہ بچوں کی ناجائز پسند اور ناپسند کے آگے بے بس ہوں۔ خیبر پختونخوا حکومت ایسے فضول کام کے لیے اخبارات میں اشتہار چھپوا کر غریبوں کے خون پسینے کی کمائی کو ضائع نہ کرے۔ ہمیں مغربی اقدار اور ثقافت کی بجائے اسلامی تعلیمات کو مشعل راہ بنانا چاہیے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں والدین، بچوں اور اساتذہ کی تربیت کرنی چاہیے اور اسکول اور کالج کے بچوں اور بچیوں کو شتر بے مہار بننے کی جو تعلیم دی جاتی ہے اس کو فی الفور بند کرنا چاہیے، کیونکہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود آیا تھا۔ نفسانفسی اور مادہ پرستی کے اس دور میں خیر پختون خوا میں سب بھی کچھ اخلاقی قدریں ہیں جن کو باقی رکھنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

اگر دیکھا جائے تو مسلمان ممالک میں جرائم کی شرح مغربی ممالک کے مقابلے میں بہت کچھ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ مسلم دنیا میں اب تک شرم وحیا کا دامن مغرب کی طرح تار تار نہیں ہوا۔ امریکا اور دوسرے مغربی ممالک میں اخلاقی قدروں کا جنازہ اٹھ چکا ہے، وہاں اگر بچے، بچیاں غیر اخلاقی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو ان کے والدین کا بھی یہی حال ہے۔ اس لیے بے کار کی اشتہار بازی کی بجائے کے پی حکومت اسکولوں اور کالجوں میں بچوں کی کردار سازی اور تربیت پر توجہ دے۔

(روزنامہ اسلام)

☆☆☆

فرعون کا تخت اور سیکولر آمریت

اگر کسی حکمران، سیاسی رہنما، تجزیہ نگار یا دانشور کو یہ گمان ہے کہ مراکش کے ساحلوں سے لے کر برونائی کی سرزمین تک کسی بھی ایسی حکومت کو فوج یا عالمی طاقتوں کی مدد سے ختم کر دیا جائے، جو خالصتاً جمہوری عمل اور عوام کی کثرت رائے سے برسر اقتدار ہو اور جو ملک کے عوام کی امنگوں کے مطابق اسلامی طرز زندگی کو نافذ کرنا چاہتی ہو تو اس دہشت گردی اور بربریت کا اثر باقی ممالک کی عوام پر نہیں ہوگا، تو یہ ان سب کی لاعلمی، کوتاہ خیالی اور زمینی حقائق سے بے خبری ہوگی۔ اس لئے کہ دنیا بھر میں اس وقت جتنی بھی اسلامی تحریکیں جمہوری جدوجہد کے ذریعے اپنے ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کی کوشش کر رہی ہیں، ان کے روحانی اور علمی رہنماؤں کی کتابیں اور لٹریچر دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہو کر تقریباً ہر ملک میں پہنچ چکا ہے اور ہر ملک کی تحریک کا ہر کارکن دوسرے ملک کے رہنماؤں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ وہ انہیں ایک اجتماعی قیادت کا حصہ بھی سمجھتا ہے۔ موجودہ دور میں اسلام پر لکھنے والی سب سے بڑی مصنفہ کیرن آرم سٹرانگ نے اپنی کتاب ''خدا کے لیے جنگ'' (The Battle for God) میں اس کی پوری تاریخ بیان کی ہے۔ اس مصنفہ کے مطابق کئی صدیوں بعد اسلام کے سیاسی نظام کے لئے جدوجہد اور طریق کار کی آواز برصغیر سے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تحریروں کے ذریعے بلند کی۔ اس سے پہلے تک امت بادشاہت، عثمانی خلافت کی مرکزیت اور فقہ کے جھگڑوں میں الجھی ہوئی تھی اور مغرب کے سیاسی نظام سے مغلوب ہو کر اس نے فلاحی کاموں پر زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز کر رکھی تھی۔ لیکن مغرب کے اس سیکولر نظام اور کمیونسٹ اشتراکیت کو پہلی دفعہ اس شخص نے للکارا اور ایک جمہوری جدوجہد سے اسلام کے نظام کا راستہ دکھایا۔ مصر کی اخوان المسلمون، جو ۱۹۲۱ء میں قائم ہوئی تھی، اس وقت تک ایک فلاحی اور معاشرتی اصلاحی جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہو کر عرب دنیا میں پہنچیں تو اخوان کی قیادت نے انہیں ایک انقلابی پیغام کے طور پر لیا اور پھر ان سے متاثر، سید قطب شہید کی کتب نے اخوان المسلمون کو انقلاب کا راستہ دکھایا۔ اسی سید قطب کی کتابیں آج پاکستان، ترکی، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش جیسے ممالک کی زبانوں میں ترجمہ ہو کر وہاں کی تحریکوں کے کارکنوں کو بھی راستہ دکھاتی ہیں۔ ملائیشیا

کے صوبہ کیلنٹن میں گزشتہ تین دہائیوں سے جو اسلامی جماعت برسراقتدار ہے اس کے لٹریچر میں مولانا مودودی اور سید قطب سے لے کر ہر اس شخص کی کتب موجود ہیں جو کسی بھی ملک میں اسلامی تحریک کا سرخیل ہے۔ فلسطین کی حماس ہو یا انڈونیشیا کی تحریک اسلامی، ترکی کا نجم الدین اربکان ہو یا مراکش کا غنوشی سب عالمی سطح پر ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہ ہیں او رنظریات کو بھی یکساں سمجھتے ہیں۔ ان سب کے کارکنوں، ہمدردوں اور بہی خواہوں کے دل بھی ایک دوسرے کے ساتھ دھڑکتے ہیں اور وہ ان کا درد بھی امت مسلمہ کا جسدِ واحد ہونے کی حیثیت سے محسوس کرتے ہیں۔

اس سارے پس منظر میں اگر کوئی شخص یہ تصور کر بیٹھا ہے کہ مصر میں اخوان المسلمون کی اس حکومت کو، جو جمہوری طور پر برسرِ اقتدار آئی تھی او رجس نے ایک اسلامی آئین کے لیے چونسٹھ فیصد ووٹ حاصل کیے تھے، عالمی استعمار کی مدد سے اور فوجی بغاوت کے ذریعے ختم کر کے نہتے عوام پر گولیاں برسا کر باقی تمام ممالک میں راوی چین ہی چین لکھے گا تو اس سے بڑی خام خیالی کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس پوری سازش کی ایک لمبی کہانی ہے جس کے پیچھے امریکہ اور اس کے حواری ممالک کی پروردہ فوج، مصر کے سرمایہ دار اور میڈیا نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ میڈیا کے ''ٹائی کون'' نجیب سوبریس نے اپنے چینل کے ذریعے مرسی حکومت کے خلاف پہلے اقلیتوں کے حقوق کی نام نہاد کہانیاں شروع کیں اور پھر ان سرمایہ داروں نے تیل، گیس اور بجلی کا بحران پیدا کیا، جو نیل کے جزیرے میں عالیشان مکانوں میں رہتے ہیں اور جن میں سے اکثریت نے اسرائیل کی یہودی عورتوں سے شادیاں کر رکھی ہیں۔ اس کے بعد شریعت، جو اکثریت کا مطالبہ تھا، کو خوفناک بنا کر پیش کیا گیا۔ جب یہ سب کچھ ایک جمہوری حکومت کو متزلزل نہ کر سکا تو چند لاکھ افراد کو سڑکوں پر لا کر فوج کے لیے بغاوت کے منصوبے پر عمل کرنے کی راہ ہموار کی گئی۔ اس کے بعد کی کہانی انتہائی خوفناک اور دردناک ہے۔ فوج کے آتے ہی پٹرول پمپوں پر تیل بھی ملنے لگا اور گیس بھی۔ لوڈ شیڈنگ بھی ختم ہوگئی۔ لیکن عوام کو اندازہ تھا کہ سب کیوں ہو رہا ہے اس لیے وہ اپنی جمہوری جدوجہد پر قائم رہے۔ پھر ان نہتے لوگوں پر گولیاں برسائیں گئیں۔ سو کے قریب لوگ اللہ اکبر کہتے ہوئے سینہ تان کر گولیاں کھاتے رہے اور اپنے مقام پر بیٹھے رہے۔ دو دن قبل اس پُرامن ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے ان پر ٹینک چڑھا دیئے گئے۔ تین ہزار کے قریب افراد نے اس راہِ حق میں جان اپنے اللہ کے سپرد کر دی۔ پوری دنیا کا میڈیا اس قتل عام پر چپ سادھے رہا۔ نہ کسی کو انسانی حقوق یاد آئے اور نہ ہی جمہوری سیاست۔ اس لیے کہ دنیا بھر میں جمہوری سیاست کا مطلب یہ تصور کر لیا گیا

ہے کہ ایسا الیکشن اور ایسی جیت جس میں اللہ کا نام سنائی نہ دے۔ یہ دنیا اب ایک دوسرے سے اتنی بھی دور نہیں رہ گئی کہ اسے حقیقت کا علم نہ ہو سکے، بلکہ اب تو میڈیا اگر مجرمانہ خاموشی اختیار کرتا ہے تو سوشل میڈیا گھر گھر وہ خبر پہنچا دیتا ہے جس کی تصدیق بھی ضروری نہیں ہوتی۔ افواہ بھی وہاں خبر بن جاتی ہے اور لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ اس المیے، بلکہ خونچکاں اور خوفناک المیے کا ایک پہلو ایسا ہے کہ اگر دنیا بھر کے مسلمان ملکوں کے حکمران، سیاسی رہنما اور دانشور اس معاملے پر غور نہیں کر رہے تو ایک دن وہ آتش فشاں کی طرح ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں، وہاں دو طرح کے طریقِ کار ہیں اور دونوں میں اختلاف ہے۔ ایک جو جمہوری ذریعے سے، لوگوں کی رائے عامہ سے اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں اور دوسرے جو بزورِ طاقت باطل قوتوں سے جہاد کر کے حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ شریعت نافذ ہو سکے۔ طاقت سے حکومت حاصل کرنے والے گزشتہ تیس برسوں میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو اس لیے اپنا ہمنوا بنا چکے ہیں کہ الجزائر میں جمہوری حکومت کو برسرِ اقتدار نہ آنے دیا گیا، افغانستان کی مستحکم حکومت پر قبضہ کیا گیا اور عرب دنیا کے بعض ممالک میں سیکولر ذہن رکھنے والے حکمرانوں کو کھلی چھوٹ دی گئی۔ ان کو مغرب کی پشت پناہی بھی حاصل رہی۔ جب گزشتہ دو سال پہلے عرب دنیا میں ایک انقلاب کی لہر شروع ہوئی تو دنیا بھر نے اسے ایک سیکولر جمہوری جدوجہد کا نام دیا۔ ایسے میں طاقت کے بل بوتے پر اسلامی انقلاب کے داعی جمہوری راستے پر چلنے والوں کو سیکولر فتنوں کے عزائم سے ڈراتے رہے، اس کے باوجود اخوان المسلمون نے جمہوری راستہ اپنایا۔ وہ اخوان، جو گزشتہ نوے سال میں سیکولر ڈکٹیٹروں کے ہاتھوں اپنے دو لاکھ افراد کی قربانی دے چکی تھی، لیکن تاریخ نے اخوان کے اس جمہوری راستے کو غلط ثابت کیا۔ پھر ظلم یہ کہ پوری مسلم امہ کے کسی بھی جمہوری ملک کے سیاست دانوں اور دانشوروں نے ان کی حمایت میں دو لفظ بھی ادا نہ کیے۔ لیکن یہ سب لوگ اپنی خاموشی سے ایک ایسے آتش فشاں کو جنم دے رہے ہیں جس کا لاوا اچانک پھٹا کرتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ جمہوری راستے کی بات کریں گے تو لوگ سوال کریں گے کہ مصر میں اخوان نے یہ راستہ اختیار کیا تھا تو اس وقت تم کہاں تھے؟ وہ لوگ جو طاقت کے ذریعے انقلاب چاہتے ہیں ان کی حمایت میں اضافہ ہوگا۔ یہ لوگ ایک اچانک موڑ کی طرح قوموں کی شاہراہ پر نمودار ہو جایا کرتے ہیں اور جب قوموں پر ایسے لمحے آتے ہیں تو حکمرانوں، دانشوروں اور سیاست دانوں کو جواب دینے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔

☆☆☆

ہسپتال اور جیل

انسان کے جسم کا فطری نظام اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ ذمہ داری کے تحت کام کرتا رہتا ہے۔اس نظام میں انسان کی اپنی غفلت، کوتاہی، بدپرہیزی کی بنا پر فساد پیدا ہوتا ہے تو پھر وہ اس کا علاج کراتا ہے۔کسی حکیم، ڈاکٹر، یا کسی بھی معالج کے پاس جاتا ہے۔اپنے جسم کی کھوئی ہوئی صحت واپس لانے کے لیے معالج کی ہر ہدایت پہ عمل کرنا ہوتا ہے۔

کڑوی کسیلی دوائیں، انجکشن اور نت نئے ٹسٹوں کے چکر میں ہسپتالوں کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں ..... کھانے پینے میں پرہیز کرنا ایک الگ امتحان ہوتا ہے .....معاملہ زیادہ خراب ہوجائے تو ہسپتال میں داخل ہو کر معالجوں کے رحم وکرم پہ خود کو اجنبی ماحول میں رکھنا پڑتا ہے.....''پرہیز علاج سے بہتر ہے'' کی نصیحت پہ کان دھرنے ہوتے ہیں۔

اگر مریض کو تندرستی چاہیے تو یہی راستہ ہے..... انسان اپنے جیسے انسان کے علم پہ تو بھروسا کرتا ہے اس کی ہدایات پہ عمل کرتا ہے مگر افسوس کہ اپنے خالق کے علمِ ہدایت پہ کامل بھروسا نہیں کرتا جس نے انسان کے جسم کی طرح روح بھی دنیا میں صحت مند اور سراسر سلامتی کے ساتھ انسان کے باطنی وجود کے طور پر اتاری ہے۔

روح بھی غفلت، کوتاہی، بدپرہیزی، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بیمار ہو جاتی ہے۔اس کے بھی اللہ تعالیٰ نے ''معالج'' پیدا کیے ۔ ہر بیماری کے لیے ''شفا'' اتاری گئی ہے۔روح کی صحت یابی کے لیے بھی ''نسخے'' ہوتے ہیں۔اس کے ''معالج'' بھی ایک نصاب اور ڈگری کے مالک ہوتے ہیں۔یہ بھی ''خوراک'' دیتے ہیں۔دوا کی .....''پرہیز'' بتاتے ہیں ..... روح کے علاج کی بھی ''علاج گاہیں'' یا مطب وہسپتال ہوتے ہیں۔جہاں ''پانچ بار'' اپنا چیک اپ معمول کے مطابق کرایا جاتا رہے تو روح صحت یاب رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرتاً سلیم پیدا کیا ہے، دنیا میں آنے کے بعد شیطانی اکساہٹیں، حالات وواقعات، تعلیم وتربیت، ماحول اس کی فطرت میں تبدیلیاں لاتے ہیں اور روح پر اپنے اثرات چھوڑ دیتے ہیں۔اگر اس روح کو اس کی غذا نہ دی جائے اور صحت کا خیال نہ رکھا جائے تو یہ بیمار ہوجاتی ہے۔ انسان اپنے ظاہری جسم کے لئے بہت حساس ہوتا ہے۔ اس کی خوبصورتی، تندرستی کے لئے بہت وقت پیسہ خرچ کرتا ہے۔کڑوی دوائیاں کھاتا انجکشن

لگواتا ہے۔حتیٰ کہ آپریشن کروا کر اپنے جسم کا کوئی عضو اپنے سے علیحدہ بھی کر دیتا ہے کہ باقی جسم کو نقصان نہ پہنچے اور زندگی کی رونقوں میں واپس آنے، صحت حاصل ہو جانے کی توقع اور خوشی کا تصور سب مشکل کام کروا دیتا ہے۔مگر روح کی پژمردگی، بیماری کا علاج بروقت نہیں کرتا۔اپنے نفس کی برائیوں کو آپریشن کر کے روح سے کاٹ کر نہیں پھینکتا، نتیجتاً گناہوں کا ناسور بڑھتا جاتا ہے......حتیٰ کہ اس کا صحت کی طرف لوٹنا مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔

دنیا کے ہسپتال میں داخل جسمانی مریض تو تندرست ہو کر خوش و خرم زندگی کی رونق لے کر اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ آتا ہے۔گھر والے، دوست احباب اس کا پھولوں اور مٹھائیوں سے استقبال کرتے ہیں۔مبارک بادیں ملتی ہیں۔مگر......روح کا بیمار جب علاج نہیں کرتا، صحت کی تمنا نہیں کرتا تو وہ محروم ہو جاتا ہے......اس استقبال سے، حقیقی زندگی کی رونقوں سے جو خالق و مالک اپنے ''صحت مند'' بندوں کو عطا فرمائے گا۔اپنے رب سے ملاقات کے وقت کوئی ''سلام و مرحبا'' سنائی نہ دے گا۔

''یا ایتہا النفس المطمئنۃ'' صدا سے محرومی ہی دراصل حقیقی محرومی ہے۔

اپنی روح کو صحت مند رکھنے اور اس کی بیماری کا فوری علاج کرنے کی ذمہ داری خود انسان کے اوپر ڈال دی گئی ہے۔''معالج'' (انبیاء) اور ''نسخے'' (کتابِ ہدایت) اللہ تعالیٰ نے مہیا کر دیئے ہیں۔

یہ بھی قابل غور بات ہے کہ بیمار روح کے مالک لوگ معاشرے میں جرم کرتے ہیں، جرم کرنے والے کو ہر معاشرہ سزا دیتا ہے۔سزا جرم کے مطابق ہوتی ہے۔کسی کو صرف سرزنش کافی ہوتی ہے۔کسی کو مار پڑتی ہے، کہیں ہاتھ کٹتا ہے، کہیں گردن۔اور کوئی سنگسار کیا جاتا ہے یا کوئی حوالات سے واپس آ جاتا ہے، کسی کو جرمانہ کیا جاتا ہے، کوئی عمر قید بھگتتا ہے، با مشقت قید اور بھی ذلت بھری قید مقدر بن جاتی ہے۔جیلیں مجرموں کو ان کے کیے کی سزا دلانے کے لیے ہوتی ہیں جہاں وہ اپنے پیاروں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارنے کے خواب دیکھتے ہیں او رایک ایک دن گن گن کر گزارتے ہیں۔قید اور جیلیں مجرم کو سبق سکھانے کے لئے ہوتی ہیں۔دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے ہوتی ہیں۔غلطی کرنے پر سزا ملنا عدل ہے۔دنیا میں یہ سب ایک نشانی ہے۔عبرت و نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے۔جرائم پیشہ لوگ کسی نہ کسی روحانی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔کفر اور شرک دنیا کی بُری بیماریاں ہیں، ان میں مبتلا لوگ اور منافق و فاسق بھی اللہ تعالیٰ کے مجرم ہوتے ہیں۔کچھ ان جانے میں گناہ (جرم) کر بیٹھتے ہیں، کچھ جان بوجھ کر بھی اپنے اوپر ظلم کر لیتے ہیں۔تو ان کا ضمیر ان کو کچوکے لگاتا ہے اور یہی کچوکے ان کے لئے کافی ہوتے ہیں۔یہ گنہگار یا مجرم معافی

کے فوری مستحق ہوتے ہیں۔ سرزنش ہی ان کی سزا ہوتی ہے۔

کچھ مجرم قبر کی قید میں رہتے ہیں۔ وہاں سے نکل کر ''حشر'' کی مشقت میں ڈال دیئے جائیں گے۔ پل صراط کی سختی میں مبتلا ہوں گے۔ اپنے اپنے جرائم کے مطابق جہنم (سجّین) کے قید خانے میں ڈال دیئے جائیں گے۔ ہر کسی مجرم کو جرم کے مطابق مدت اس جیل میں گزارنی ہوگی۔ اور ذلت کی زندگی اور کچ لہو اور تھوہر کانٹے کے درخت غذا کے طور پر مجرموں کو کھلائے جائیں گے۔ اپنی اپنی مدتِ قید بھگت کر مجرموں کو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور عدل کے مطابق نجات دیتا جائے گا۔ کوئی حوالات (قبر کی قید) بھگت کر آزاد ہو جائے گا اور بعد کے مراحلِ عذاب سے نجات پا جائے گا اور کچھ مجرم عمر قید بھگتیں گے۔ کچھ مجرم رہائی پا کر اپنے گھر والوں (نیک لوگوں کے ساتھ جنت میں) جا ملیں گے۔ انسان دنیا کی سزاؤں سے ڈرتا ہے۔ تھانے، کچہری، حوالات، ہسپتال بھگتنے سے ڈرتا ہے۔ جیل کی زندگی سے ہول کھاتا ہے۔ جرم پہ پردے ڈالتا ہے۔ رشوتیں دے کر اپنے آپ کو جرم سے بَری کراتا ہے۔ لیکن بھول جاتا ہے۔ وہ جیل جس کا داروغہ غضب ناک ہے اس کے دل میں رحم اور نرمی کا شائبہ تک نہیں اور وہ اپنے حاکمِ اعلیٰ ربِّ کائنات کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتا۔ اس قید با مشقت اور جیل کی ہولناکی سے بچنے کا آج ہی موقع ہے۔ آج اور ابھی سے.....

''اللّٰھم انا نعوذ بک من عذاب جہنم۔''

☆☆☆

محشرِ خیال

حفصہ افضال۔ گجرات

رب تعالیٰ کی بابرکت ذات سے پوری امید ہے کہ آپ کا رمضان بہت اچھا اور خوبصورت نیکیاں سمیٹتے ہوئے گزرا ہوگا۔ دعا ہے کہ آپ ہمیشہ ''فاستبقو الخیرات'' والوں میں شامل رہیں آمین۔

ماہنامہ بتول ماشاء اللہ بہت اچھا ماہنامہ ہے جو ایک عرصے سے اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے جس کے لئے آپ اور آپ کی ٹیم یقیناً داد اور مبارکباد کی مستحق ہے۔ گو کہ طنز و مزاح کی کمی اکثر و بیشتر ہی محسوس ہوتی ہے لیکن ''ہلکا پھلکا'' میں آنے والی کوئی سی بھی ہلکی پھلکی تحریر اس کمی کو خاطر خواہ پورا کر دیتی ہے۔

مجھے بتول سے صرف ایک ہی شکایت ہے اور وہ اس کی ترسیل کے حوالے سے ہے ہر دوسرے مہینے ماہنامے کا نہ ملنا اور اگر ملے تو مہینے کے آخری ایام میں جب اگلا پرچہ آنے کو ہو۔

☆☆☆

فہمیدہ اجمل۔ ساہیوال

بہت سالوں بعد دوبارہ بتول سے رابطہ بحال ہوا۔ ہر شمارہ اپنی مثال آپ ہے۔ خصوصاً قاضی صاحب والا۔ 20یا25 سال بعد دوبارہ پڑھنا شروع کیا سارے ہی نئے نام ہیں سوائے قانتہ رابعہ کے اور ہر ایک کی تحریر زبردست۔ میں نے 78یا79 میں لکھنے کی ابتدا بتول سے ہی کی بالکل نوعمری کی تحریر ''تلواروں کی جھنکار'' شائع ہوئی جب میٹرک کی سٹوڈنٹ تھی۔ اس رسالے نے اتنی پذیرائی دی کہ حد نہیں۔ پہلی تحریر تو نہ بھولنے والی چیز ہوتی ہے اس لئے یاد رہ گئی۔ 77ء کے شمارے مل سکتے ہیں یا نہیں؟ بہت خوبصورت افسانے تھے اور خوبصورت نام۔ پروین پری سیف اور حمیرا راحت صاحبہ۔ اب تو نام بھی بھول گئے۔ زر سے ذات اور پریری کتے جیسی تحریریں پتہ نہیں کس رائٹر کی ہوں گی لیکن آج بھی دل پر نقش ہیں۔ بہرحال اللہ سب کی کاوش قبول کرے اور سب لکھنے والی بہنوں کا زورِ قلم اور زیادہ کرے۔ آپ کی پرانی قاری۔

☆77ء کے شمارے قارئین کی ذاتی فائل میں ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پاس دفتر کا ریکارڈ تو موجود ہے مگر زائد نہیں۔

☆☆☆